کہاں حکایت ہستی سنی، کم زیست ہی دیکھی
اسی کو لکھا ہے، جو آنکھوں نے میری دیکھا ہے
(رومی)

یادوں کے چراغ

ابوالقلم حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومی مدظلہ
مفتی شہر آگرہ



شائع کردہ
دارالقلم، آشیانہ جامع مسجد آگرہ

نام کتاب : یادوں کے چراغ

مصنف : حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومی مدظلہ
مفتی شہر آگرہ

صفحات :

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت :

سن اشاعت : ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۸ء

کتابت : محمد خورشید عالم

طباعت : عالمی اُردو پریس
عربی مدرسہ، سہارنپور۔ 9897652415

:ملنے کے پتے :

☆ دارالقلم، آشیانہ جامع مسجد آگرہ

☆ دارالقلم، غریب خانہ تلسی پور (وصی آباد) الہ آباد

☆ مکتبہ مجلس ترجمان حق، محلہ مفتی، سہارنپور

کون سا ''چراغ'' کہاں روشن ہے؟

نمبر ۸۰۸

سند الفراغ

من المدرسة العربية الشهيرة بمظاهر علوم الواقعة في سهارنفور

الحمد لله الذي خلق الانسان من طين ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهين ثم فضله على كثير ممن خلقه وجعله خليفة في ارضه ففاق الملائكة المقربين والصلوة والسلام على حبيبه وخير خلقه سيد الاولين والآخرين سيدنا ومولانا محمد وآله واصحابه وازواجه وذرياته واتباعهم اجمعين الى يوم الدين. اما بعد فان اخانا في الدين المولوي عبد القدوس ابن المولوي سراج الحق المتوطن في بلدة الٰه آباد قد دخل هذه المدرسة العالية الشهيرة بمظاهر علوم الواقع في بلدة سهارنفور في اوائل شهر شوال المكرم سنة ثلث وستين بعد الالف وثلثمائة من الهجرة النبوية على صاحبها الصلوة والتحية واقام فيها سنة ولم يزل بجد يقرأ ويسمع حتى قرأ من الكتب المتداولة من علم الحديث الصحاح الستة نعني بها الجامع الصحيح للامام الهمام ابي عبد الله محمد بن اسمعيل البخاري والجامع الصحيح للامام الاجل مسلم بن الحجاج القشيري والسنن للامام ابي داود سليمان بن الاشعث السجستاني والجامع للامام محمد بن عيسى الترمذي مع كتاب الشمائل له والسنن للامام ابي عبد الرحمن احمد بن شعيب النسائي والسنن للامام ابن ماجة القزويني واكثر شرح معاني الآثار للامام احمد بن محمد ابي جعفر الطحاوي الحنفي الازدي والموطا للامام محمد بن الحسن الشيباني صاحب الامام الهمام ابي حنيفة رحمه الله تعالى والموطا للامام مالك بن انس صاحب المذهب ولما حل مطايا السفر لعلاقة من تحصيل مرامه واوطاره طلب منا السند واستجازنا لكتب ذلك وغيره بسند الدرجة الثانية بما قرأه علينا او غيره وهو يسمع كما اجازنا مشائخنا الكرام على الشروط المعتبرة عند علماء هذا الشان ونوصيه بتقوى الله تعالى في السر والعلن وبلزوم السنة السنية واجتناب البدعة الفضيحة وان يشتغل بتعليم العلوم الدينية وان لا يميل الى الدنيا الدنية وان يتزيا بزيهم وان لا ينسانا في صالح دعواته في خلواته وجلواته وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين وصلى الله على افضل الانبياء والمرسلين سيدنا ومولانا محمد وآله واصحابه واتباعهم اجمعين۔ شعبان ۶۶ھ

العبد ... عبد الرحمن ...

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تشکر وامتنان

شکر نعمتهائے تو چنداں که نعمتهائے تو

احقر کی تقریباً ۸۸ سال کی طویل تکمی اور معذوری کی مدت حیات میں اُسے اپنے نکمے پن کی وجہ سے عبادت و ریاضت کی زندگی گزارنے کی توفیق کامل تو شاید میسر نہیں ہو سکی لیکن یہ ایک بڑی خوش نصیبی ضرور ہاتھ آ گئی کہ اُسے اس طویل مدت زندگی میں متعدد اہل معرفت مشائخ اور اہل حق علماء دین سے شرف ملاقات اور بعض کی خدمت گزاری کے مواقع ضرور مل گئے۔

''یادوں کے چراغ'' نامی یہ رسالہ احقر عبدالقدوس رومی کے قلم سے لکھا ہوا ایک مختصر تاریخی تذکرہ ہے جس میں احقر نے اپنے دور حیات میں موجود ان اکابر و مشائخ کا تذکرہ کیا ہے جنکی زیارت و خدمت کے مواقع اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے احقر کیلئے مقدر و میسر فرما دئے تھے۔

ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم

''یادوں کے چراغ'' نامی یہ مختصر تذکرہ خواہ علمی حیثیت سے کسی قسم کی اہمیت کا حامل قرار نہ دیا جائے لیکن دینی حیثیت سے اس کی تاریخی اہمیت کا انکار بھی یقیناً دشوار ہوگا۔ اُمید کہ اہل نظر اصحاب دین اِسے قدر کے ہاتھوں لیں گے اور شوق کی نگاہوں سے پڑھیں گے۔

ابوالقلم رومی

آشیانہ جامع مسجد، آگرہ — ۲ رشوال المکرّم ۱۴۲۸ھ

یادوں کے چراغ

یادوں کے اس چراغ کو روشن رکھے خدا
اس کو کبھی بجھا نہ سکے تندیٔ ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

خطبۂ آغاز

حمد بیحد اُس خدائے پاک کی
جس نے یوں عزت بڑھائی خاک کی

خاک سے پتلا بنا انسان کا
جس کو بخشا تاج زر ایمان کا

بھیجے انسانوں میں صدہا انبیا
جن کی اُمت میں ہزاروں اولیا

سرورِ عالم ہوئے ختم رسل
رہبر دارین اور ہادیٔ کل

آپؐ کے اصحابؓ تھے مثل نجوم
دین حق کی کر گئے دنیا میں دھوم

ہر جگہ چمکا ستارہ آپؐ کا
فرش سے تا عرش سکہ آپؐ کا

اُن پہ بھیجا حق نے جب اپنا درود
خود سمجھ لیں ہوگا وہ کیسا درود

ہاتھ میں لیں آپ یادوں کے چراغ
اہل دیں کا آپ پائیں گے سراغ

اس کو جلتا ہی رکھیں بجھنے نہ دیں
صرصر ایام پاس آنے نہ دیں

حق تعالیٰ اس کو فرمائے قبول
ہے جو غنچہ کھل کے ہوجائے یہ پھول

دل افزا یادوں کے چراغ

۱۴۲۸ھ

ممکن نہیں بھلا سکے تم کو کبھی جہاں
تم سے جہاں میں لاکھ سہی تم مگر کہاں

جلائے رہتا ہوں ہردم چراغ یادوں کے
اسی سبب سے مرے روز و شب منور ہیں

یادوں کے اس چراغ سے روشن ہے زندگی
پایا ہے جس سے دل نے مرے ذوق بندگی

یادوں کا اک چراغ جلاتا ہوں ان دنوں
یادیں جو مرگئی تھیں جلاتا ہوں ان دنوں

نفس کی آمد و شد کا بدل گیا انداز
چراغ زیست کی اب روشنی بھی دھیمی ہے

نہیں ملی ہے جو گویائی مجھ کو سحباں کی
خدا کے لطف سے انداز تو کلیمی ہے

کرم سے اپنے تو رومیؔ کو کردے مالامال
مرے کریم ترا کام ہی کریمی ہے

راقم مستغیر حقیر عبدالقدوس رومیؔ
مفتی شہر آگرہ

اکابر و مشائخ

مولوی دادا

حضرت مولانا مولوی محمد اکبر احمدیؔ رحمہ اللہ تعالیٰ

یہ ہمارے پورے خاندان والوں کے مولوی دادا تھے۔ انکے نام کے علاوہ انکے متعلق کوئی صحیح معلومات نہ ہوسکیں۔

یہ ایک نوعمر مولوی صاحب تھے جو روپوشی کے طور پر کسی طرح مچھلی شہر (ضلع جون پور) پہنچ گئے تھے۔ ہمارے جدامجد حضرت حافظ قاری فضل حق صاحب کے والد بزرگوار مولوی عبدالحق عرف صوبہ میاں نے ایک روز اپنے محلّہ (قضیانہ) کی مسجد میں اِنہیں دیکھا اور ایک پردیسی مسافر سمجھ کر اپنے گھر لے آئے۔ اِنہیں کھانا کھلایا اور اپنے گھر کے باہری حصہ میں اِن کے قیام کا انتظام کر دیا اور کچھ عرصہ کے بعد اپنے دونوں لڑکوں (حافظ فضل حق اور مولوی حفیظ الحق) کی تعلیم اِن سے متعلق کر دی۔ کچھ دنوں بعد محلّہ کے دوسرے لوگوں نے بھی اپنے بچوں کو تعلیم کیلئے اِن کے پاس بٹھا دیا، اس طرح وہ پورے محلّہ کیلئے مولوی دادا ہوگئے۔ اپنے والدین سے سنا کہ حضرت موصوف نے ہم دونوں بھائیوں (جامی ورومی) کو بچپن میں گود کھلایا تھا۔

راقم سطور کو اُنہیں اُن کے زمانۂ بیماری میں دیکھنا اور اُن کے لئے دوا لے جانا ہی یاد ہے، جس وقت میری عمر ۱۰ سال سے بھی کم ہی رہی ہوگی اُس وقت اُنہوں نے تقریباً ۱۱۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

موصوف کے نام کے ساتھ اُن کی نسبت ''احمدی'' مجاہد کبیر سیّد احمد شہید رائے بریلویؒ کی طرف ہے گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے بقیۃ المجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ واللہ اعلم

حضرت سیّد نجم الدین شاہ نقشبندی ہنسویؒ (فتح پوری)

حضرت والدی المحترم المرحوم سرکاری ملازم تھے، ۱۹۳۶ء میں ان کا تبادلہ شہر فتح پور کے سرکاری اسکول میں ہوگیا تو ہم لوگ چند سال فتح پور (ہنسوہ) میں رہے۔ میری درسِ نظامی کی تعلیمی زندگی کا باقاعدہ آغاز قیام فتح پور ہی کے زمانہ سے ہوا۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں میری فارسی اور عربی تعلیم شروع ہوئی۔ فتح پور کے زمانۂ قیام میں وہاں کے مشہور مجذوب سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت سیّد نجم الدین شاہ علیہ الرحمہ کی شہرت سنی جو بفضلہٖ تعالیٰ اس وقت بقید حیات اور تندرست تھے لیکن گراں گوش تھے۔ اسلئے اُن کی خدمت میں عرض معروض تحریری طور پر ہی ہوسکتی تھی۔ حاضری کے وقت سلام ومصافحہ کے بعد دعا کی درخواست پر مشتمل ایک مختصر تحریر پیش خدمت کی تھی لیکن وہ اپنے عالم جذب ہی میں رہتے تھے اور لوگوں کو عموماً بھگا دیتے تھے۔ کبھی کسی کو تھپڑ بھی مار دیتے تھے، جسے عام طور پر لوگ اپنے حق میں فال نیک ہی تصور کیا کرتے تھے، اُنکی خدمت میں حاضری وزیارت بفضلہٖ تعالیٰ متعدد بار نصیب ہوئی۔

احقر کے جد امجد اِنہی شاہ صاحب سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ وصی آباد الٰہ آباد کے ڈاکٹر ناظم الدین حضرت شاہ صاحب کے پرپوتے ہیں، انہوں نے اور انکے چھوٹے بھائی نجیب الدین سلّمہٗ نے مجھ سے بھی کچھ پڑھا تھا۔ غالباً ہم لوگوں کے فتح پور سے چلے آنے کے بعد اُن کی وفات ہوئی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مجھے اِس دین پرور خانوادہ سے محبت ہے
اِن ہی اللہ والوں کی محبت میری دولت ہے

حضرت حکیم الامت اشرف العلماء مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

احقر تقریباً ۱۲ سال کی عمر تک الہ آباد ہی میں رہا جہاں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے مشہور مجاز و خلیفہ حضرت مولانا سیّد محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ قیام پذیر تھے۔ اس وجہ سے بچپن ہی میں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کا تذکرہ کان میں پڑنے لگا تھا۔ الہ آباد میں ۱۲ بزرگوں کے ۱۲ دائرے تھے جن کی وجہ سے الہ آباد پوری طرح "بدعت گڑھ" بنا ہوا تھا اور جگہ جگہ اہل سنت اور اہل بدعت کے درمیان بحث و مباحثہ کے ساتھ ساتھ طرفین کی طرف سے اشتہار بازی کا بازار گرم رہتا تھا۔

اسی ماحول میں احقر کا پورا بچپن گزرا جس نے بچپن ہی سے اس موضوع کا مناظر بنا دیا تھا، علماء دیوبند کی آمد پر جلسوں سے متعلق اعلانات و اشتہارات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں حضرت والد صاحب جب فتح پور میں تھے تو حضرت حکیم الامت بغرض علاج کان پور تشریف لائے تو والد صاحب بغرض ملاقات کان پور گئے اور اپنے ساتھ مجھے اور برادرِ عزیز سعدی سلمہٗ کو بھی لے گئے تھے۔ اسی موقع پر حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا اور بعض ملفوظات بھی سننے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت کا یہ ملفوظ خوب یاد ہے، فرمایا کہ ہچکی آنے کے وقت لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی یاد کر رہا ہے، یہ ایک طرح کا نفسیاتی علاج ہے تا کہ وہ سوچنے لگے کہ کون یاد کر رہا ہے، سوچنے کی وجہ سے ہچکی بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت سے یہ ارشاد بھی سنا تھا کہ لوگ عدم قصد ایذا تو کرتے ہیں مگر قصد عدم ایذا نہیں کرتے۔

فتح پور ہی سے تعلیم کیلئے مظاہر علوم سہارنپور جانا ہوا تھا جہاں تقریباً سات سال تک تعلیم کا سلسلہ رہا۔ اس طویل زمانۂ تعلیم میں خدا جانے کتنی بار تھانہ بھون میں اور سہارنپور میں بھی اور لکھنؤ میں بھی حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کی، ملفوظات سنے اور اصلاحی مکاتبت سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ فللہ الحمد ولہ الشکر

احقر نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت کی تجدیدی خدمات کے تین نمایاں پہلو محسوس کئے:

۱۔ رسم و حقیقت کے درمیان خط فاصل قائم فرمایا۔

۲۔ امورِ اختیاریہ اور غیر اختیاریہ کی تفریق نمایاں فرمائی۔

۳۔ حضرات اہل علم کو عزتِ علم و عزتِ نفس اور استغناء کی تلقین بڑے اہتمام و تاکید سے قولاً و عملاً فرماتے رہے۔

بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ   بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

۱۳۶۲ھ رجب کے مہینہ میں جب راقم الحروف مظاہر علوم میں جلالین شریف پڑھ رہا تھا حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ اُس وقت صاحب فراش اور علیٰ شرف الرحیل تھے اور ہم لوگ عیادت و زیارت کیلئے تھانہ بھون حاضر بھی ہو چکے تھے کہ اچانک جلالین شریف کے سبق میں جو صبح کے ابتدائی وقت میں پڑھائی جاتی تھی دورانِ درس حضرت حکیم الامت کے سانحۂ وفات کی غمناک و حسرتناک خبر ملی۔ ہم دونوں بھائی (جامی و رومی) اُسی وقت تھانہ بھون کی مقررہ وقت پر جانے والی ٹرین سے تھانہ بھون روانہ ہو گئے جس کی وجہ سے حضرت کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کی سعادت حاصل [illegible]

[illegible] پتہ چلا تھا وہیں حضرت کا ایک مرثیہ بھی لکھا تھا [illegible]

مگر اسکی نقل یا اصل اب میرے پاس کہیں محفوظ نہیں البتہ اسکے دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

ناز کرتے تھے بجا تجھ پہ رشید و امداد ۔۔۔ ہو گیا آہ جدا دیدۂ چشم یعقوب
لاکھ چاہا مگر افسوس کہ آنسو نہ تھمے ۔۔۔ ہم سے دیکھا نہ گیا نیر تاباں کا غروب

۳ ۴ ۹ ۱ ،

حضرت استاذی مولانا اسعد اللہ صاحب اسعد رامپوریؒ کے اکابر حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ کی طرف سے ایک مصرعہ تاریخ نکال دیا تھا جو خاتمۃ السوانح میں طبع ہو چکا ہے

"دفن شد زیر زمیں عم شفیق"

۱۳۶۲ھ

ابن شیر خدا حضرت مولانا سیّد مرتضٰی حسن چاند پوری رحمہ اللہ

الہ آباد کی ایک انجمن اصلاح المسلمین جس کی بنیاد حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کاکورویؒ کے ایما پر رکھی گئی تھی اس انجمن کے سالانہ جلسوں میں حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب کی تشریف آوری بھی ہوتی تھی۔ اس موقع پر مجھے اُنکو قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور اُنکی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مولانا کا اصل مزاج و مذاق یہ تھا کہ "وہ نہ تو کتمانِ حق کر سکتے تھے اور نہ اہل باطل سے کسی سمجھوتے کیلئے تیار ہوتے تھے۔"

بحمدہ تعالیٰ و بفضلہ یہی اپنی مزاجی کیفیت بھی رہی ہے، ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ چنانچہ جامع مسجد آگرہ میں بعد نماز جمعہ رضا خانی صلوۃ و سلام پڑھنا چاہتے تھے جبکہ میرا بیان پہلے سے اُسی وقت ہوا کرتا تھا، صلح کل انتظامیہ نے تجویز کیا کہ ایک در میں میرا بیان ہو اور دوسرے در میں اسی وقت مروجہ صلوۃ و سلام

پڑھا جائے۔ میں نے اس موقع پر صاف کہہ دیا کہ میں کسی بدعت اور بدعتی سے سمجھوتا نہیں کر سکتا۔

مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

حضرت مولانا سیّد مرتضٰی حسن صاحبؒ سے ایک بار سہارنپور سے الہ آباد جاتے ہوئے سفر میں بھی ملاقات کی نوبت آئی، چاند پور اسٹیشن پر وہ اچانک نظر آ گئے تو میں نے اُنہیں اپنے ہی ڈبہ میں تشریف لانے اور بیٹھنے کی دعوت دی، وہ تشریف لے آئے اور اس موقع پر اُنہوں نے تأسف کے ساتھ اظہار تأثر کیا کہ میری کتابوں سے عام طور پر علماء نے بھی فائدہ نہیں اُٹھایا صرف مولوی منظور نعمانی نے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اب راقم سطور کو حیرت و تعجب ہے کہ عصر حاضر کے ایک مشہور تاریخ نگار جنہیں صلح کلی ادارہ کی صلح کلیت کو محفوظ رکھنے کی بڑی فکر دامنگیر رہتی تھی اور وہ خود بھی اسی صلح کلی حصار میں ایسے گھرے ہوئے تھے کہ اُنہیں حضرت مولانا سیّد مرتضٰی حسن صاحب چاند پوریؒ نہ تو کہیں علامہ سیّد سلیمان ندویؒ کے استاذوں میں نظر آئے اور نہ وہ مولانا کے اصل کام اور صحیح مقام سے واقف ہو سکے۔ حضرت مولانا چاند پوریؒ حضرت مولانا تھانویؒ کے ہم سبق اور مجاز بیعت تھے۔ دار العلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات اور رئیس المناظرین تھے۔ تفصیلی حالات کیلئے دیکھئے "بزم اشرف کے چراغ"۔

استاذ محترم حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب کشتہ دیوبندی علیہ الرحمہ

احقر نے بعض وقتی حالات کے تحت مشکوٰۃ شریف بجائے مظاہر علوم سہارنپور کے دارالعلوم دیوبند میں پڑھی، جہاں مشکوٰۃ شریف کی دو جماعتیں تھیں، ایک جماعت حضرت مہتمم (مولانا قاری محمد طیب) صاحب سے متعلق تھی جس میں بیس طلبہ تھے اور بڑی جماعت جس میں اسّی طلبہ تھے حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کے پاس تھی۔ احقر بھی اُسی جماعت میں شریک کیا گیا تھا اور جلد ہی عبارت خانی میں روانی کی وجہ سے جو مظاہر علوم میں استاذی حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے شرح مأتہ اور ہدایۃ النحو پڑھنے کی بدولت حاصل ہوگئی تھی، جماعت میں اپنا ایک مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جس کے نتیجہ میں مشکوٰۃ شریف کا باب الدعوات ایک ہی روز کی عبارت خوانی میں ختم ہوگیا تھا۔ پہلے ہی روز عبارت پڑھنے پر ساتھ میں بیٹھے ہوئے ایک پنجابی ساتھی نے پوچھا کہ ''آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی ہے؟'' میں نے جواب دیا مظاہر علوم میں۔ بولے عبارت اچھی پڑھتے ہیں۔ الحمد للہ بہت صاف صاف نہایت روانی کے ساتھ عبارت کی ترکیب نظر میں رکھتے ہوئے عبارت پڑھتا تھا، چنانچہ ہر درسگاہ میں اساتذہ کو میری عبارت خوانی پسند تھی۔ یہاں ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے، دورہ کے سال میں کوئی قدیم طالب علم مدرسہ مظاہر علوم میں آئے اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے پوچھا کہ ''مدرسہ میں سب سے اچھی عبارت کون پڑھتا ہے؟'' مولانا نے بے ساختہ جواب دیا میں پڑھتا ہوں۔ اُنہوں نے پوچھا نہیں طلبہ میں کون پڑھتا ہے، تو حضرت نے احقر کے متعلق فرمایا کہ یہ طلبہ میں سب سے اچھی عبارت پڑھتے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب علیہ الرحمہ سے میرا خصوصی تعلق یہ بھی تھا

کہ اُن سے میرے دادا نے (جو اُنکے غالباً ہم عمر ہی رہے ہونگے) بھی فرخ آباد کے زمانۂ قیام میں پڑھا تھا۔ مولانا دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد جامع مسجد فرخ آباد میں امام مقرر ہو گئے تھے اور میرے دادا وہاں سپرنٹینڈنٹ (کلکٹریٹ) تھے، اُن سے وہیں مشکوٰۃ شریف اُنہوں نے پڑھی تھی۔ حضرت مولانا نے مشکوٰۃ شریف کے باب مناقب صحابہؓ میں حضرت سیدنا عمر فاروقؓ سے متعلق حدیث فضیلت پڑھاتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ ''تمہارے دادا نے اِس حدیث (ان الشیطان لیفر من ظل عمر) پر مجھ سے یہ سوال کیا تھا کہ شیطان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے سے کیوں نہیں بھاگتا تھا اور حضرت عمر فاروقؓ کے سائے سے بھاگتا تھا؟'' فرمایا کہ میں نے اُن کو یہ جواب دیا تھا کہ چور بدمعاش کلکٹر سے نہیں بھاگتے کوتوال اور داروغہ سے بھاگتے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کی احقر پر شفقت و توجہ دو پشتوں سے تھی، وہ میرے والد محترم اور میرے جد امجد کے بھی استاذ تھے، میرے والد صاحب مرحوم جب دارالعلوم دیوبند پڑھنے کیلئے گئے تو مولانا ہی کے گھر رہتے تھے، چنانچہ مولانا نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ تمہارے والد تو میرے پاس ہی رہتے تھے مگر اب میری مالی حالت ایسی نہیں ہے ورنہ میں تم کو بھی اپنے گھر پر ہی رکھتا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے بہت سادہ اور بے تکلف آدمی تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

شیخ الاسلام صاحب فتح الملہم حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

صدر مہتمم دار العلوم دیوبند

آں موصوف کو سب سے پہلے مدرسہ مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر جامع مسجد میں دیکھا، اور اُن کا بہترین مفید و مؤثر وعظ سنا۔ مولانا شبیر احمد صاحب نے ابتدائے وعظ اکبر الہ آبادی مرحوم کے ان اشعار سے کی تھی۔

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اُس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا
جب سر میں ہوائے طاعت تھی، سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

مولانا کا خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ تحریر و تقریر زبان و قلم دونوں ہی میدانوں کے شہ سوار تھے، اُن کی متعدد تصانیف میں ''العقل والنقل'' نامی رسالہ مجھے بیحد پسند رہا ہے۔ جس میں اُنہوں نے ہر حکم شرعی کو عقل سلیم کے موافق ثابت کیا ہے۔ یہ رسالہ میرے استاذ خاص حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رام پوریؒ کو بھی بہت پسند تھا اور حضرت موصوف ہی نے مجھے اِسکے دیکھنے کا مشورہ دیا تھا کہ اِس رسالہ کو ضرور دیکھو اور اس کو دل و دماغ میں محفوظ کر لو، ان شاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ اِس کا نفع محسوس کروگے۔

میں نے مشکوٰۃ شریف جب دیوبند میں پڑھی یہ وہ زمانہ تھا جب دار العلوم میں ایک اسٹرائک ہو چکی تھی اور حضرت علامہ شبیر احمد صاحبؒ صدارت اہتمام سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اُس کے احتجاج میں پانچ علیا کے مدرسین نے استعفاء دے دیا

تھا اور اُن کی جگہ پُر کرنے کیلئے بعض نئے مدرسین لائے گئے تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا ابرار الحق صاحبؒ اشرف المدارس ہردوئی کے اوّلین طلبہ کو لیکر دار العلوم دیوبند کی زیارت اور اکابر سے ملاقات کیلئے آئے تھے۔

اس موقع پر وہ حضرت مولانا عثمانیؒ سے ملاقات کیلئے اُنکے مکان بھی تشریف لے گئے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ملنے گیا تھا، گفتگو میں حضرت علامہؒ نے بڑے تأثر کے ساتھ فرمایا تھا کہ مجھے دار العلوم سے اپنے علیحدہ ہونے کا اتنا افسوس نہیں جتنا اس پر افسوس ہے کہ اب دار العلوم میں ایسے اساتذہ بلائے گئے ہیں جنہیں علم سے مس بھی نہیں ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ''آئینہ دار العلوم دیوبند'' میں اس قضیہ نامرضیہ کی تفصیل درج ہے۔

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اکثر و بیشتر اپنی تقریر کا افتتاح یا اختتام اکبر الہ آبادی کے اشعار پر کرتے تھے، مثلاً

ہے دلِ روشن مثالِ دیوبند — اور ندوہ ہے زبانِ ہوشمند
اب علیگڑھ کی بھی تم تشبیہ لو — اک مہذب پیٹ بس اُسکو کہو
پیٹ ہے سب کا مقدم اے عزیز — لیک فکر آخرت ہے اصل چیز

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رُک نہیں سکتی
کسی سے مغرب و مشرق کی سازش رُک نہیں سکتی
وہ نزلہ رُک نہیں سکتا یہ پیچش رُک نہیں سکتی
مگر اپنے بزرگوں کی یہ خواہش رُک نہیں سکتی
مذاقِ قوم بیگانہ نہ ہو اللہ اکبر سے
یہ نقشِ جاں فزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

نائب شیخ الاسلام صاحب اعلاء السنن

حضرت علامہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

تھانہ بھون کی آمد و رفت کافی رہی تھی، اس لئے وہاں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کی زیارت و ملاقات کے مواقع بھی بار بار ملے۔ جب پہلی مرتبہ دونوں بھائیوں نے اُن سے خانقاہ تھانہ بھون میں ملاقات کی تو والد صاحب کا نام سن کر فرمایا، کہ اچھا وہ ادیب صاحب جو الہ آباد میں گورنمنٹ کالج کے پروفیسر ہیں۔ مولانا عثمانیؒ قرآن مجید نہایت عمدہ تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے، خوش آواز اور خوش بیان بھی تھے، قصیدہ بردہ کا ورد رکھتے تھے، اُنکی عربی شاعری میں عربیت کا مکمل انداز ہوتا تھا۔ "نور علی نور" وغیرہ کے نام سے اُن کے دو ایک عربی قصیدے میرے پاس ہیں۔ وہ قصیدے اس لائق ہیں کہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کیے جائیں مگر افسوس ہے کہ سیاسی تحزب کی وجہ سے وہ داخل نصاب نہیں کئے گئے۔ ایک سال مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ کا بیان بوقت صبح جامع مسجد سہارنپور میں ہوا تھا جس میں اُنہوں نے حسب معمول "انقلاب زندہ باد، برطانیہ مردہ باد" کے نعرے بلند آواز سے یہ کہہ کر لگوائے کہ اتنی زور سے نعرہ لگائیے کہ ہمالیہ کی چوٹیاں ہل جائیں۔ اُسی روز حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے بعد نماز عصر مظاہر علوم کے دار جدید کی مسجد میں سورہ زلزلہ (حج) کی ابتدائی آیات پڑھ کر اپنے وعظ کا آغاز فرمایا اور یہ فرمایا کہ انقلاب زندہ باد کے محض نعروں سے بات نہیں بنے گی بلکہ باطن میں انقلاب لانے کی ضرورت ہے، اپنے باطن میں انقلاب پیدا کیجئے۔ یہ وعظ نہایت مؤثر اور بہت مفصل و مدلل تھا جو عشاء کی جماعت سے پہلے ختم ہوا تھا۔ حضرت مولانا کی سب سے بیش قیمت علمی یادگار مجموعۂ احادیث سے احناف کے

مستدلات کا انتخاب ہے جو اعلاء السنن کے نام سے تقریباً بیس جلدوں میں پاکستان و عرب وغیرہ سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۴۸ء میں احقر نے مشرقی پاکستان کے صدر مقام ڈھاکہ کا سفر حضرت مولانا کے بڑے صاحبزادہ مولانا عمر احمد عثمانی کی دعوت پر کیا تھا جہاں ہم لوگوں کے بعض رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ مگر میں اپنے نو وارد مسافر ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب علیہ الرحمہ کی قیامگاہ پر پہنچا تھا جو اس وقت حبیب بینک کی عمارت میں قیام پذیر تھے۔ حضرت مولانا مظاہر علوم کے تعلیمی زمانہ ہی سے مجھ سے واقف تھے چنانچہ ایک روز مولانا کا مہمان رہ کر اپنے رشتہ داروں کے گھر چلا گیا تھا، جس زمانہ میں مسلم لیگی حلقہ سے جمعیۃ علماء ہند کے بالمقابل جمعیۃ علماء اسلام قائم ہوئی تو حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اُس کے صدر اوّل اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اُس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے۔ احقر اُس وقت مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں مدرس تھا، وہاں بھی جمعیۃ علماء اسلام کا قیام ہوا اور مولانا سیّد فاخر علی امام جامع مسجد مراد آباد کو اُس کا صدر اور احقر کو نائب صدر مقرر کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کو تقسیم ہند کے موقع پر نظریۂ پاکستان کی تائید در اصل جمعیۃ علماء اسلام ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی، اس لئے پاکستان بننے کے وقت مغربی پاکستان میں پرچم کشائی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں اور مشرقی پاکستان میں پرچم کشائی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں سورہ فتح کی ابتدائی آیات انا فتحنا لك فتحا مبينا پڑھ کر ہوئی تھی۔ نور اللہ مرقدہما و برد اللہ مضجعہما

حضرت امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ

حضرت امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی مجددی رحمہ اللہ تعالی ایک وسیع النظر محقق، مصنف اور مناظر تھے، اُنکے کارناموں کا اصل موضوع بحث ردِروافض تھا۔ مولانا موصوف اِس سلسلہ میں بڑا کام کر گئے ہیں۔ ہمارے خاندان سے اُن کے مزاج و مذاق کے اسی دینی بنیاد پر روابط خاندانی طور پر متوارث رہے ہیں۔ حضرت کے والد محترم اور راقم کے جد امجد علیہما الرحمۃ سرکاری ملازمت میں ایک ساتھ رہ چکے تھے جسکا احساس خود حضرت موصوف اور انکے اَخلاف صاحبزادوں اور پوتوں کو بھی برابر رہا جوان کی عالی نسبی اور شرافت خاندانی کا ہی اثر ہے۔

احقر ۱۹۴۶ء میں سنی ہائی اسکول لکھنؤ میں فارسی و عربی کے معلم کی حیثیت سے تھا جہاں تقریباً دو تین سال قیام رہا۔ اِس پوری مدت میں حضرت موصوف کی خدمت میں برابر حاضری ہوتی رہی تھی اور حضرت موصوف کے بیان تفسیر، وعظ اور بعض مناظرے کی مجالس میں شرکت ہوئی۔ رمضان المبارک میں موصوف بعد عصر تا مغرب درس قرآن دیتے تھے، اس میں بھی برابر شرکت ہوتی اور افطار بھی وہیں حضرت کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔

ارشاد نبویؐ کے مطابق موصوف کے یہاں افطار میں تعجیل پر ہمیشہ ہی معمول رہا، عام طور پر شاید روافض کی معیت و صحبت کی وجہ سے اہل سنت بھی افطار میں تعجیل نہیں کرتے لیکن موصوف کے ہاں اس پر عمل بہت نمایاں نظر آیا۔ افطار میں تعجیل کی سنت پر ہم لوگوں میں اہتمام نہیں تھا، اس لئے مجھے وہاں کی تعجیل کچھ عجیب اور غیر مانوس محسوس ہوتی اور برابر دل کو یہ کھٹک رہتی کہ خدا جانے اِس تعجیل میں روزہ ہوتا ہی ہے یا نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف غلط رواج کی اثر پذیری ہی کا نتیجہ تھا۔ ہمارے

حضرت مولانا فاروقی "احقاقِ حق، اثبات سنت اور بالخصوص ردِروافض میں فردِ فرید تھے۔ حضرت موصوف کی سوانح عمری اُنکے عزیز قریب خواجہ عبدالحئی فاروقی (لائبریرین ہمدرد یونیورسٹی، دہلی) تحریر کر چکے ہیں جو لائق دید ہے۔

صاحب کمالات علمیہ حضرت مولانا حبیب احمد محقق کیرانویؒ

ایک وسیع النظر محقق اور فقیہ تھے، اُن کی وسعت نظر کی وجہ سے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے اپنی تصنیفات پر نظر ثانی اور تحقیق مزید کیلئے بامعاوضہ مقرر فرمادیا تھا۔ ان کی وسعت نظر کے اس کمال کو ان کی ضرورت سے بڑھی ہوئی صاف گوئی اور بیباکی نے داغدار بنا دیا تھا، جس کی بہت سی مثالیں ہیں مگر یہاں صرف دو ایک ہی کو پیش کر دینا کافی ہوگا، حضرت سیّدنا حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے معاملہ سے متعلق ان کا یہ تبصرہ و فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ "حضرت حسینؓ کی یہ جنگ دنیا کیلئے تھی دین کے لئے نہیں تھی۔"

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ نے ان کی اس تعبیر کو ناپسند فرماتے ہوئے فرمایا تھا کہ وہ اس بات کو ان الفاظ میں بھی کہہ سکتے تھے کہ "حضرت حسینؓ نے حکومت واقتدار کے لئے اقدام جنگ کیا تھا۔"

راقم سطور نے بھی اپنی ایک تحریر میں شہادت حسینؓ کو شہادت فی سبیل اللہ کے بجائے من قتل دون عرضہ کے تحت شہادت قرار دیا ہے۔ ان کی شہادت سے متعلق معین کاشانی شیعی کا یہ شعر مشہور ہے۔

سرداد نہ داد دست دردست یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

بالکل خلاف حقیقت واقعیہ اور خالص قسم کی بیجا عقیدت مندی کی منہ بولتی تصویر ہی کہا جائے گا کیونکہ واقعہ کربلا کی صحیح روایات میں واقعہ کا یہ موڑ یقینی طور پر ملتا

ہے کہ حضرت سیدنا حسینؓ امیر المؤمنین یزیدؒ کے پاس جا کر بیعت کیلئے تیار ہو گئے تھے کہ اُن جیسی معزز اور اہم شخصیت کیلئے یہی صورت قابل قبول ہو سکتی تھی۔ امیر المؤمنین کے کسی نائب یا نمائندہ کے ہاتھ پر بیعت کیلئے اصرار کرنا اور اسی نفسانی مطالبہ پر انہیں شہید کر دینا کسی طرح صحیح و درست نہیں کہا جا سکتا، اس موقع پر مشہور مسلم سیاسی رہنما محمد علی جوہر صاحب کے اس مشہور شعر پر بھی ذرا غور کر لیا جائے، وہ فرما گئے ہیں

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے   اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سوال یہ ہے کہ تاریخ اسلام میں کتنی کربلائیں ہوئیں؟ واقعہ کربلا تو صرف ایک بار ۶۰ھ میں پیش آیا تھا نہ اس سے پہلے کوئی سانحہ کربلا ہوا، نہ اُس کے بعد کربلا میں کوئی جنگ ہوئی تو ''ہر کربلا'' کہنا کیسے صحیح ہوگا؟

دوسری بات یہ کہ یہ جنگ کفر و اسلام کی جنگ کب تھی، یہ جنگ تو صرف حکومت وانتظام ہی کی جنگ تھی کیونکہ جنگ کے دونوں فریق مسلمان ہی تھے۔ ایسی ہی جنگ اس کے علاوہ عبداللہ ابن زبیرؓ سے بھی ہوئی تھی جیسے وہ جنگ کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی، اسی طرح یہ جنگ بھی کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی جسے روافض نے غلط طور پر کفر و اسلام کی جنگ ٹھہرا کر عاشورا میں کھچڑے کھانے اور جاڑوں میں بھی شربت پینے کا احمقانہ بندوبست کر دیا اور ناواقف سنی آسانی سے بے وقوفی کا شکار ہو گئے۔

اوپر مذکور مشہور فارسی شعر کے شاعر کا نام معین الدین کاشانی ہے، جسے غلط طور پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری چشتیؒ کی طرف منسوب کر کے سنیوں کے زبان زد اشعار میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مولانا کیرانویؒ سے احقر نے دریافت کیا تھا کہ شیعوں کے متعلق آپ کی

کیا تحقیق ہے؟ فرمایا کہ میں اُنہیں کافر سمجھتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ تو علی الاطلاق اُن کی تکفیر کے قائل نہیں ہیں؟ برجستہ فرمایا کہ میں نے اُنکی کتابیں دیکھی ہیں، حضرت نے نہیں دیکھیں!

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کی شہرت جس انداز میں لوگوں تک پہنچی ہوئی تھی اُس انداز میں اُن کے قائل و معترف بالکل نہیں تھے، فرماتے تھے کہ لوگ انہیں متبحر عالم کہتے ہیں، یہ ایک لحاظ سے تو ٹھیک ہے لیکن فی الحقیقت صحیح نہیں ہے۔ ایک متبحر تو مچھلی ہوتی ہے اور دوسرا متبحر سوکھا کدو بھی ہوتا ہے، وہ بھی دریا میں تیرتا رہتا ہے لیکن حقیقی متبحر تو مچھلی ہوتی ہے۔ شاہ انور صاحبؒ کو دوسرے معنی میں متبحر سمجھتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جتنے وسیع النظر اور جتنی قوت حفظ کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے محقق کیرانویؒ اتنے ہی عمیق النظر اور فقیہ النفس قسم کے آدمی تھے چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی جملہ تصنیفات اور تالیفات خصوصاً تفسیر و حدیث اور فقہ و فتاویٰ سے متعلق نقد و نظر کیلئے مولانا کیرانویؒ کو مقرر و مامور فرمایا تھا، چنانچہ وہ حضرت تھانویؒ کے سرفہرست محقق معتمد تھے۔

ربیع الاول (بارہ وفات) کے مہینہ میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ نے اپنے خصوصی مزاج و ذوق کے تحت ''مدح صحابہؓ'' پر مشتمل نظم و اشعار پڑھتے ہوئے ''مدح صحابہؓ'' کا جلوس نکالنا شروع کیا، روافض نے اس کے بالمقابل ضد میں ''قدح صحابہ'' اور تبرا پر مشتمل جلوس نکالنا شروع کر دیا، دونوں جلوسوں میں مقابلے بازی اور جنگ شروع ہو گئی، تھانہ بھون سے ''جلوس مدح صحابہؓ'' کے خلاف فتویٰ شائع ہوا، مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے اس فتویٰ کا رد شائع کیا تو مولانا حبیب احمد کیرانویؒ نے مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے فتویٰ کا رد شائع کیا۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ جب کانپور بغرض علاج تشریف لائے وہ اُسی

دور کا سفر تھا، حضرت کے علم میں جب اس ردو قدح کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ اگر میں نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا تو اسی میں لگا رہتا اور کوئی دوسرا کام نہ ہو سکتا۔

"تفسیر حل القرآن" مولانا کیرانوی کی نہایت جامع مانع تفسیر اردو میں ہے جو حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی فرمائش پر تحریر فرمائی گئی تھی، اس میں روافض، نیچری، اہل بدعت کے افکار کی قاعدے سے خبر لی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ خاص طور پر قابل دید اور یادگار ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء

مولانا کیرانوی علمائے دیوبند میں پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مودودی صاحب کے آزاد اجتہاد کا نوٹس لیا اور انہیں نقد رسید دی تھی جو رسالہ رد المغالطات وغیرہ کے نام سے اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ احقر کو زمانہ طالب علمی میں مولانا موصوف سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سلف کی یادگار دو بزرگوار

﴿۱﴾ حضرت شاہ محمد یٰسین صاحب نگینوی علیہ الرحمہ

﴿۲﴾ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی علیہ الرحمہ

ان مرحوم و مغفور دو بزرگوں کی یاد کے ساتھ ہی مدرسہ مظاہر علوم کے ان سالانہ جلسوں کی بھی یاد آجاتی ہے جس کا مفید و مؤثر یادگار سلسلہ خدا جانے کس وجہ سے بند ہو گیا۔ احقر کے زمانہ طالب علمی میں ان جلسوں کی تاریخیں جب قریب آنے لگتی تھیں تو ان تاریخوں سے بہت پہلے ہی اُس کے انتظامات شروع ہو جاتے تھے اور مستطیع و خوش حال طلبہ سے مہمانوں کے بستروں کے لئے تکئے اور بچھانے کی چادریں، اوڑھنے کی بھی کچھ چادریں مستعار لی جاتی تھیں جس کے کسی گوشہ پر اسی کا نام اور حجرہ نمبر لکھ دیا جاتا تھا اور سب طلبہ بڑی خوشی سے اس میں معاون و شریک ہوتے تھے۔ یہ تمہید تو بڑی حد تک موضوع تحریر کے غیر متعلق ہے، مقصد تو یہ ہے کہ مدرسہ کے انہیں سالانہ جلسوں میں بہت سے علماء وقت حضرات واعظین و مقررین اور اکابر و مشائخ بھی تشریف لاتے تھے چنانچہ انہیں یادگار جلسوں میں مندرجہ عنوان سلف کی یادگار یہ ہر دو بزرگوار بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ وہ زمانہ احقر کی ابتدائی طالب علمی کا تھا اسی دوران ان دونوں بزرگانِ دین کی زیارت اور خدمت میزبانی کے مواقع احقر کو بھی نصیب ہو سکے تھے اور بات صرف زیارت ہی کی حد تک رہی تھی، مہمان ذیشان بزرگوں میں شمار ہوتے تھے اصل میزبان تو ان کے ارباب مدرسہ ہی ہوتے تھے۔ ہم طلبہ تو لہو لگا کے شہیدوں میں گنائے جانے والوں میں سے ہوتے تھے۔ حضرت شاہ محمد یاسین صاحب علیہ الرحمہ کو مرشد وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سے اجازت حاصل تھی۔ آخر شوال ۱۳۶۱ھ کو حضرت شاہ

صاحب کی رحلت ہوئی وہ بلاشبہ مدرسہ کے سرپرست، سچے بہی خواہ اور اکابر کے نمونہ تھے۔ اُستاذ محترم حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کو حدیث پڑھانے کے دوران تمباکو کھانے سے احتراز کی نصیحت حضرت شاہ صاحبؒ ہی نے فرمائی تھی جس کا تذکرہ غالباً فضائل قرآن کے مقدمہ میں حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے کیا ہے۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی علیہ الرحمہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مرید اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری علیہ الرحمہ کے مجاز تھے۔ حضرت مولانا مدرسہ کے مخلص سرپرست اور نگراں تھے، بلاخوف لومۃ لائم حق بات فرمانے سے گریز نہ کرتے تھے، مدرسہ کے ہر شعبہ کی جانچ فرماتے اور مدرسہ کے حالات کی پوری تحقیق و تفتیش فرماتے تھے جو مدرسہ کی سرپرستی کا واقعی حق ہے۔ حضرت سہارنپوریؒ کے ہجرت مدینہ فرمانے کے وقت ۱۳۴۴ھ میں مدرسہ کے سرپرست منتخب ہوئے تھے، یکم شعبان ۱۳۶۰ھ کو مدرسہ اپنے ایسے مخلص، حق گو سرپرست اور فقیہ مظاہر علوم حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے سچے جانشین سے محروم ہو گیا۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب کا ترجمۂ قرآن مجید ہی اُن کا ایک یادگار کارنامہ ہے جو حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے بیان القرآن سے بھی پہلے وجود میں آچکا تھا۔ موصوف طبقۂ علماء کے اُن افراد میں سے تھے جنہوں نے اُردو زبان میں اپنی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں جمع الفوائد کے آخری باب "باب المناقب" کا ترجمہ "درر الفرائد" کے نام سے ہے، اپنے شیخین کی سوانح عمریاں "تذکرۃ الرشید" اور "تذکرۃ الخلیل" لکھ کر حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد بعض حضرات نے خواہ مخواہ لکھ کر شہیدوں میں داخل ہونے کی کوشش کی ہے۔ میرے والد صاحب کو اور خود مجھے بھی مولانا میرٹھی کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم بہت پسند رہے ہیں۔ آپ کی ساری ہی تصانیف اس لائق تھیں کہ وہ ہر طالب

کو بروقت دستیاب ہو سکیں مگر کبھی کے حقوق طبع محفوظ کرانے کی وجہ سے دوسرے لوگ شائع نہیں کر سکے اور غالباً آپ کے متعلقین اور رشتہ دار اشاعت کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے شائع نہیں کر سکے، اِس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی دور اندیشی یا کرامت کا انکار دشوار ہی ہوگا کہ آپ نے اپنی تصانیف کی اشاعت کے حقوق محفوظ نہیں کرائے جس کی وجہ سے آپ کی جملہ تصانیف برابر آسانی سے شائع کی جا سکتی ہیں۔

حضرت مولانا میرٹھی کی چھوٹی موٹی تصانیف میں اُن کی دو مختصر کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک تو "داڑھی کی قدر و قیمت" جو اس موضوع پر قابل مطالعہ رسالہ ہے، دوسری تصنیف "بہترین جہیز" ہے جو آپ نے اپنی صاحبزادی کی رُخصتی کے موقع پر کچھ نصیحتیں فرمائی تھیں، اُنہیں تحریر میں لا کر جہیز کے طور پر اُن کے گوش گزار فرمایا گیا ہے۔ طبقۂ علماء میں جن حضرات کو فرد فرید کہا اور لکھا جا سکتا ہے اُس کے پیش نظر آپ بھی یقیناً فرد فرید ہی کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو سب سے پہلے شاید اپنے خاص رفیق درس مفتی محمد یحییٰ صاحبؒ مظاہر علوم کی تقریب نکاح کے وقت دیکھا تھا، ان کی شادی دوران تعلیم ہی ہو گئی تھی۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب علیہ الرحمہ نے اسی زمانے میں تبلیغ کا یہ مروجہ طریقہ اپنے منامات اور اپنے خاص ذوق کی بناء پر شروع کیا تھا۔ اس معاملہ کو اس طرح بھی سوچا اور سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا جانے کیسے کیسے مختلف عوامل کی وجہ سے وہ

پورا دور متعدد تحریکات کا زمانہ آغاز بن گیا تھا۔

تحریک نیچریت، تحریک قادیانیت، تحریک خاکسار، تحریک چکڑالویت، تحریک مودودیت وغیرہ اُسی زمانہ میں یکے بعد دیگرے وجود میں آئیں تھیں اور تھوڑے ہی زمانہ تک اِن کا شور و غلغلہ برپا رہا۔ اُس وقت کی برپا تحریکوں میں سے بعض تو تھوڑے ہی زمانہ کے بعد مردہ یا نیم مردہ ہو گئیں، تحریک قادیانیت پوری طرح مردہ نہیں ہوئی ہے کبھی کبھی اور کہیں کہیں شہر سے دور دراز دیہاتوں میں پہنچ کر اپنے دامِ تزویر میں پھنسا کر سادہ لوح مسلمانوں کو برابر گمراہ کرتے رہنے میں مشغول ہے۔ آگرہ کے قرب و جوار میں بھی اُن کی سرگرمیاں اِس وقت بھی جاری ہیں، ضرورت ہے کہ مرکز دعوت و تبلیغ حضرت نظام الدینؒ دہلی کے شورائی صدور کرام اس طرف بھی اپنی کچھ توجہ مبذول فرمائیں۔

احقر نے اپنے زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو مظاہر علوم میں بارہا دیکھا ہے، وہ مدرسہ کے سرپرست بھی تھے، اُن کی زبان میں لکنت اور ہکلاہٹ تھی جسکی وجہ سے تقریر میں روانی تو آ ہی نہیں سکتی تھی لیکن اُنہیں اپنی تحریک تبلیغ سے ایسا گہرا لگاؤ اور تعلق تھا جس نے اُنہیں عدیم المثال شخصیت بنا دیا تھا۔

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ

حضرت مدنی علیہ الرحمہ سے پہلی ملاقات و زیارت تو اُس وقت ہوئی جب وہ رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ میں نینی جیل سے رہا ہو کر شاہد فاخری صاحب کی مسجد دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد میں تشریف لائے ہوئے تھے اور وہیں روزہ افطار کیا تھا اور نماز مغرب بھی پڑھائی تھی۔ احقر کو بھی وہاں حاضر ہونے اور افطار و جماعت میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ اِس کے بعد کئی بار زیارت تو ہوئی مگر تلمذ کی نوبت

قصداً نہیں آئی البتہ حضرت مولانا کے صاحبزادہ گرامی مرتبت مولانا اسعد مدنی مرحوم سلم العلوم میں میرے ہم سبق رہے، اُن سے تعلقات مختلف انداز سے رہے وہ مجھے دار الافتاء دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے ماتحت امارت شرعیہ ہند سے بھی باقاعدہ وابستہ کرنا چاہتے تھے مگر وہ ہی بات مانع رہی جو طرفین بخوبی جانتے تھے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوریؒ

مظاہر علوم کے زمانہ تعلیم میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی زیارت سے بارہا مشرف ہونے کا موقعہ ملا اور احقر نے بار بار زیارت بھی کی ہے لیکن زیادہ قریب ہونے کا نہ موقعہ ہی ملا نہ اِس کی زیادہ کوشش کی نوبت آئی کیونکہ یہ معاملہ دل سے تعلق رکھتا ہے اور دل ایسی چیز ہے جو بیک وقت محبت و تعلق میں دوسرے کی شرکت گوارہ ہی نہیں کر سکتا۔ احقر کو بچپن ہی سے حضرت حکیم الامت اشرف العلماء مولانا تھانوی کے عقیدتمندوں کی زیارت اور خدمت میں حاضری کے مواقع نصیب ہو چکے تھے اور بدن کا بہت ہی چھوٹا سا عضو ہے جس میں ایک ہی ذات کی محبت و عقیدت کی گنجائش ہوتی ہے کسی دوسرے کی محبت دل کے حاشیہ ہی میں کہیں جگہ پا سکتی ہے۔

البتہ حضرت شاہ صاحب موصوف کا ایک خاص اور قابل ذکر واقعہ احقر کے علم میں ہے جسے یادوں کے اس چراغ میں شامل کر کے چراغ کو مزید روشن بنانے کیلئے یہاں سپردِ قلم کئے دیتا ہوں کہ قلمبند ہو جانے کے بعد اِسے کسی طرح راہِ فراموشی نہ مل سکے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ مادرِ علمی مدرسہ مظاہر علوم کی مجلس شوریٰ میں خانقاہ تھانہ بھون کے ناظم مولانا شبیر علی صاحب فاروقی کا نام شامل کرنے کی تجویز مجلس شوریٰ میں

ر غور آئی تو استاذ محترم حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نے اپنے رجحان اور خصوصیت مزاج کی وجہ سے اس سے اختلاف کیا اور وجہ اختلاف پوچھے جانے پر بتائی کہ وہ تو اپنی بات پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ وجہ اختلاف حضرت شاہ صاحب کو کچھ زیادہ معقول اور باوزن نظر نہ آئی اور شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنی بات پر اگر اصرار کرتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے آپ کو تو اپنی بات پر اصرار کرنے سے نہیں روکتے، آپ بھی انہیں کی تقلید کر لیجئے گا اور اپنی بات پر آپ بھی اصرار کر لیا کیجئے گا۔ راقم کو حضرت شاہ صاحب کا یہ جواب بہت پسند ہے، اس سے موصوف کی کشادہ دلی اور انصاف پسندی کھلی آنکھوں دیکھی جا سکتی ہے۔ مندرجہ بالا تاریخی واقعہ اپنے اندر مظاہر علوم کے ارکان شوریٰ کی ذہنی و فکری اور ان کی سیاسی انداز کی کارروائیوں کو محفوظ کرتا ہے۔ اگر مورخ مظاہر علوم کا مورخ و محقق غور و فکر کی نگاہ سے دیکھے گا تو اُسے ایک واقعہ میں پوشیدہ مختلف ذہنی رجحانات دیکھنے کو مل سکیں گے۔ اُسے جس طرح اس واقعہ سے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ کی انصاف پسندی اور وسعت قلبی نظر آئے گی تو دوسری طرف اُسے حضرت شیخ الحدیث صاحب علیہ الرحمہ کی دور اندیشی بھی نظر آجائے گی جنہوں نے حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کی رکنیت شوریٰ کو خطرہ کی گھنٹی سمجھ کر ہی اس سے اختلاف کیا تھا جس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی نے مجلس شوریٰ کی پہلی ہی نشست میں مظاہر علوم میں موجودہ اس صورتحال کو قابل غور اور لائق اعتراض قرار دیا کہ ناظم اعلیٰ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید عبداللطیف پُرقاضویؒ تو مدرسہ کی کمیٹی شوریٰ سے علیحدہ ہی منتظم میں رکھے جائیں کہ وہ مدرسہ کے ملازم ہیں اور [illegible] ملازم کو یہ حق نہ ملنا چاہئے کہ وہ رکن شوریٰ (اور سرپرست مدرسہ) ہوسکیں مدرسہ کے ناظم مالیات مولوی اکرام الحسن صاحب کاندھلوی

ایڈووکیٹ کو جو حضرت شیخ الحدیث صاحب کے قریبی عزیز (سمدھی) ہیں، اس کے باوجود مجلس شوریٰ کے رکن رکین ہیں حالانکہ وہ ناظم مالیات کی حیثیت سے باقاعدہ باتنخواہ ملازم بھی ہیں۔ مولانا شبیر علی صاحب نے اس فرق و امتیاز کا سختی اور سنجیدگی سے نوٹس لیتے ہوئے ناظم مالیات کیلئے بھی یہی اصرار کیا کہ وہ صرف ایک ہی حیثیت سے مدرسہ میں رہ سکتے ہیں یا تو باتنخواہ ناظم مالیات رہیں یا بے تنخواہ رکن شوریٰ!

چنانچہ انہیں مجبور ہو کر باتنخواہ ملازم اور ناظم مالیات بننے کو اختیار کر کے مجلس شوریٰ کی رکنیت سے استعفا دینا پڑا مگر بعد میں مولانا شبیر علی صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد مولانا اکرام الحسن صاحب کاندھلوی پھر دونوں عہدوں پر فائز کر دیے گئے۔ یہ پورا واقعہ احقر نے استاذ محترم مولانا ظہور الحسن صاحبؒ سے سنا تھا!

صاحب کمالاتِ اشرفیہ حضرت مولانا سیّد محمد عیسیٰ الٰہ آبادیؒ

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ جنہیں بجا طور پر صاحب کمالات اشرفیہ لکھنا یا کہنا صحیح ہوگا بالخصوص اس پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے کہ موصوف نے اپنے شیخ و مرشد حضرت اشرف العلماء مولانا تھانویؒ کا صحیح اور قرار واقعی تعارف کرانے کے لئے ''کمالات اشرفیہ'' کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف فرمائی تھی۔

موصوف تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گورنمنٹ اسکول میں انگریزی کے استاد تھے، یہ ملازمت شاید مرزاپور سے شروع ہوئی تھی اور اسی ملازمت کے سلسلہ میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ اسکول فتح پور (ہسوہ) ہو گیا تھا جہاں حضرت شاہ گنج مراد آبادیؒ مولانا فضل رحمٰنؒ کے دو مجازین موجود تھے، ایک شاہ ظہور الاسلام بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور اور دوسرے بزرگ مولانا نور محمد صاحب پنجابیؒ جو مدرسہ کے صدر مدرس تھے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب گورنمنٹ کالج الہ آباد میں بالکل اخیر دور ملازمت میں تشریف لائے ہوں گے تو عمری کے زمانے میں راقم سطور کو بھی بعد نماز عصر ان کے دولت خانہ پر منعقد ہونے والی مجلس رشد و اصلاح میں حاضری کا اتفاق ہوا ہے اور مظاہر علوم آنے کے بعد تھانہ بھون کی حاضری کے مواقع متعدد بار آئے ہیں تو احقر کا تاثر و احساس یہی ہے کہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے شیخ و مرشد سے صرف سلوک ہی کی تعلیم و تربیت نہیں حاصل کی تھی بلکہ شاید اس بات کی بھرپور کوشش بھی کی ہوگی کہ وہ اپنے مرشد و شیخ کی ہو بہو تصویر اور ان کا عکس بھی بن جائیں اور

می دہد یزداں مراد متقیں تو چناں خواہی خدا خواہد چنیں

کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے مرشد کا عکس ہی بنا دیا تھا۔

کسی موقع پر حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے تھے اس تشریف آوری کی حکایت کرتے ہوئے حضرت قاری صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے بالکل ایسا لگا جیسے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ تشریف لا رہے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حضرت موصوف نے اپنے شیخ و مرشد کے اتباع کامل اور نقل صحیح کی کوشش میں اپنے آپ کو اس شعر کا مصداق بنا دیا تھا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ گورنمنٹ کالج الہ آباد ہی میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے تھے اسی جگہ پر بعد میں ہمارے والد محترم (مولانا محمد سراج الحق

مچھلی شہری) کا تقرر ہوا تھا اس وجہ سے بھی موصوف سے ایک طرح کا تعلق رشتہ پہلے سے قائم تھا اور وہ ہم دونوں بھائی ہمارے محترم بھائی اور احقر دونوں سے شفقت و بزرگی کے انداز پر تعلق رکھتے تھے۔ اسی سلسلہ میں صرف ایک ہی واقعہ لکھنا کافی ہوگا جو تقریباً ۵۰ سال کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود حافظہ خانۂ دماغ میں محفوظ ہے۔

مظاہر علوم میں داخلہ کے بعد عید الاضحیٰ کے موقع پر گھر پر عید منانے کی خواہش پیدا ہوئی مگر مدرسہ والوں کے مزاج اور استاذ محترم مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ کے اندیشۂ ناراضگی کی وجہ سے سفر کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اور والد صاحب سے بھی یہ توقع نہ تھی کہ وہ ہمیں رخصت لیکر گھر آنے کی اجازت دیں گے تو میں نے اپنے شفیق و مہربان اور ہمارا بہت بے تکلف "منے چچا" کو خط لکھا کہ آپ ایک خط لکھ کر ہمیں الہ آباد بلا لیں تو چھٹی مل جائے گی، انہوں نے فوراً ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر مجھے الہ آباد طلب کر لیا۔ ان کا خط آتے ہی اسے لیکر حضرت استاذ محترم کو دکھایا اور حضرت ناظم صاحبؒ سے چھٹی لیکر الہ آباد پہنچ گئے۔ والد صاحب اُس وقت حضرت مولانا موصوفؒ کی خدمت میں نانی صاحب کے مکان پر گئے ہوئے تھے اور انہیں میرا اُس وقت الہ آباد آنا کچھ اچھا نہ لگا تو حضرت موصوفؒ نے ہی کچھ سفارشی انداز میں فرمایا کہ کیا بات ہے؟ گھر آنے کو دل چاہا ہوگا آ گئے۔

یہ بات محبت و شفقت سے بھری ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ بارہ چودہ سال کے بچے کے لئے عید و بقرعید جیسے خوشی کے موقع پر مسافر بنکر مدرسہ کے دار الطلبہ میں وقت گزارنا بہرحال مشکل ہوتا ہے، اس لئے یہ سفر جرم نہیں کہا جا سکتا تھا۔

موصوف کے شاگرد آگرہ کے سابق ایڈیشنل کمشنر سید حسین صاحبؒ جو ہندوستان کے مشہور مؤرخ و علامہ سید سلیمان ندوی صاحب علیہ الرحمہ کے داماد تھے، سید صاحبؒ الہ آباد میں مولانا کے مکان پر تشریف لائے ہوئے تھے تو احقر بھی

زیارت وملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا اور موصوف کا یہ ملفوظ مجھے اب تک بھولا نہیں ہے۔ اُنہوں نے فرمایا تھا کہ "میں نے جب حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا تو مجھ سے بعض تعلق رکھنے والوں نے بہت تعجب وحیرت کے ساتھ کہا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا، آپ کا مقام تو وہ تھا کہ اُنہیں آپ سے رجوع کرنا چاہئے تھا نہ کہ آپ نے اُن سے رجوع کیا"۔

حضرت سید صاحبؒ نے ان نمائشی خیر خواہوں کی یہ بات نقل کر کے فرمایا کہ بتایئے کیا یہ لوگ میرے خیر خواہ ہو سکتے ہیں، میں نے اپنے لئے جو بات اور جو راستہ پسند کیا وہ اختیار کر لیا۔

سارا جہاں خلاف ہو پروا نہ چاہئے   پیش نظر تو مرضیٔ جاناں نہ چاہئے

حضرت مولانا محمد عیسٰی صاحب علیہ الرحمہ سے احقر کے والد صاحب احقر کے خسر حضرت سید عبد الرب صاحب صوفیؒ، ماسٹر محمد ابراہیم صاحبؒ اور اُستادِ محترم حافظ محمد یاسین صاحبؒ، برادرِ محترم مولانا جامی صاحبؒ وغیرہم تو حضرت حکیم الامت کے بعد باقاعدہ اصلاحی تعلق رکھتے تھے اور احقر نے بھی طالب علمی کے دور میں جن بزرگوں سے اصلاحی تعلق کا ارادہ کیا تھا اُن کے اسماء گرامی یہ تھے، حضرت مولانا سید محمد عیسٰی صاحب الہ آبادیؒ، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوریؒ اور حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ غریق بحر رحمت، مگر نوشتۂ تقدیر کے مطابق احقر مؤخر الذکر بزرگ سے وابستہ ہو گیا تھا رحمہم اللہ تعالیٰ وارحمنی معہم

حضرت مولانا الشاہ عبد الغنی پھولپوری اعظم گڑھیؒ

مخدوم ومکرم حضرت مولانا الشاہ عبد الغنی صاحبؒ کی زیارت تقسیم ہند سے پہلے بیت العلوم سرائے میر کے ایک جلسہ میں ہوئی تھی، احقر کی تقریب سفر یہ ہوئی تھی کہ جمعیۃ علماء اسلام کے ایک جلسہ میں اہل الہ آباد کی خواہش ہوئی کہ شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانویؒ کو الہ آباد کے سفر کی زحمت دی جائے جو سرائے میر تشریف لانے والے ہیں۔ اسی غرض سے احقر سرائے میر حاضر ہوا تھا اور وہاں گویائی سے نا آشنا کو ایک بڑے عظیم الشان جلسہ میں "آتش نو اختر" کے انداز سے ایک اسٹیج پر کچھ کہنے کیلئے بٹھا دیا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے والوں میں حکیم اختر صاحب (مقیم کراچی) مجھے برابر یاد کرتے رہتے ہیں۔

اسی اسٹیج پر حضرت موصوف بھی تشریف فرما تھے، احقر نے قرآن مجید کی آیت ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم پڑھ کر اقبال کی شعری زبان میں آیت کا ترجمہ سنا دیا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

حضرت والا کو پہلی بار دیکھنے کا یہی موقع تھا، نہایت شوق و ذوق اور جوش وجذبہ سے بھرے ہوئے اسٹیج پر رونق افروز تھے۔ بیان کے بعد حضرت نے احقر کو شاباشی دی، اس کے بعد بھی دو ایک بار الہ آباد میں زیارت ہوئی۔ الہ آباد میں حضرت کے ایک قریبی رشتہ دار رہتے تھے جن سے احقر کے مراسم حضرت ہی کی وجہ سے قائم ہو گئے تھے۔

حضرت موصوف بنوٹ کے بڑے ماہر استاد تھے، ان سے بنوٹ سیکھنے والے دو شاگرد مولانا محی الدین غازی پوری اور مولانا عبد الوحید غازی پوری

Scanned by CamScanner

مظاہر علوم کے زمانہ تعلیم میں احقر کے خصوصی و قریبی ساتھیوں میں رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے محبین و متوسلین کا ساتھ آخرت میں بھی نصیب فرمائے۔ آمین

مرشدی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری غریق بحر رحمت

اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں استاذ محترم مولانا سید ظہور الحسن صاحب کسولوی کا ہم لوگوں پر یہ احسان ہے، اللہ تعالیٰ اسکا صلہ ان کو عطا فرمائے، ہوا یہ کہ زمانہ طالب علمی میں میرے مولانا ظہور الحسن صاحب سے تعلقات خصوصی طور پر تھے چنانچہ میں نے مولانا سے مشورۃً پوچھا کہ حضرت تھانویؒ کے بعد اصلاحی تعلق کس سے قائم کیا جائے؟ تو فرمایا کہ میری ناقص نظر میں تو تم سے قریب بس ایک ہی بزرگ ہیں جو مشہور تو نہیں ہیں مگر ہیں وہ مصلح اور شیخ کامل اور وہ ذات گرامی ہے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری کی جو فتح پور تال نرجا (اعظم گڑھ) کے رہنے والے ہیں اور حضرت مولانا تھانویؒ کے خاص خلفاء میں سے ہیں، وہ میرے بھی استاذ و مربی ہیں ان سے اصلاحی تعلق ان شاء اللہ مفید و نافع ہوگا چنانچہ احقر الہ آباد سے فتح پور گیا اور چند دن حضرت مولانا کی خدمت میں قیام کر کے واپس آ گیا، یہاں آنے پر گھر کے کسی لوگ کیا چھوٹے کیا بڑے سب نے وہاں کے حالات دریافت کئے، مولانا کیسے ہیں؟ مولانا کا طرز اصلاح کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ میں نے بتلایا کہ حضرت والا نہایت نرم خو اور شفیق و منکسر المزاج بزرگ ہیں، حضرت کی مجلس بڑی بابرکت ہوتی ہے اور باتیں بہت ہی اصلاحی کام کی ارشاد فرماتے ہیں۔ میرے اس تاثر سے کئی لوگ متاثر ہوئے اور میرے بعد حضرت کی خدمت میں داخل ہو گئے۔

؎ تمہید عالی قدر مرحوم نے حالات مصلح الامت میں بھی لکھی ہے جسے یہاں اپنا وہ تاثر نقل کیا ہے جو حضرت نے عالی قدر کی فرمائش پر حالات مصلح الامت کیلئے لکھا تھا۔

وہ حضرت مصلح الامت کی زیارت پہلی بار مسجد خواص لکھنؤ میں ہوئی تھی جب کہ حضرت حکیم الامت بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت کی عیادت کیلئے حضرت مصلح الامت بھی لکھنؤ آئے تھے جسکی اطلاع خط کے ذریعہ مجھ کو بھی ہو گئی تھی، میں ان دنوں سہارنپور میں زیر تعلیم تھا چنانچہ وہاں سے الہ آباد جاتے ہوئے لکھنؤ اتر گیا بعد مغرب مسجد خواص پہنچا رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا، سوچتا ہوا گیا کہ مسجد خواص پہنچ کر کسی سے دریافت کرنا پڑے گا (کہ مصلح الامت کون ہیں اور کہاں مقیم ہیں) پھر اطمینان سے حضرت سے ملوں گا مگر وہاں صورت عجیب پیش آئی وہ یہ کہ میں متجسسانہ انداز میں جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب یہاں کس سے دریافت کروں کہ ایک دم سے ایک بزرگ شخصیت نے شاید میرا طالبعلمانہ حلیہ اور انداز تجسس دیکھ کر ہی مجھ کو پہچان لیا اور خود ہی آگے بڑھ کر مصافحہ کیلئے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑی آہستہ اور دھیمی آواز سے فرمایا "وصی اللہ"!

مزاج پرسی وغیرہ کی ضروری بات چیت کے بعد میں نے باہر جا کر کھانا کھانے کیلئے حضرت سے اجازت چاہی اور خیال تھا کہ ابھی واپس آتا ہوں لیکن مجھے کچھ دیر ہو گئی اور یہاں بعد عشاء مسجد کی روشنی بجھا دی گئی اور شب خیز حضرات طریقہ مسنونہ کے مطابق بعد عشاء فوراً ہی محو استراحت ہو گئے، اسلئے حضرت سے بھی اس وقت ملاقات نہ ہو سکی اور میں رات کی گاڑی سے الہ آباد چلا آیا۔

اس کے بعد خط و کتابت جاری رہی اور کچھ دنوں بعد ہی چاہا کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے کم از کم بیعت ہی کی درخواست کروں، اسکا ذکر پہلے حضرت مصلح الامت سے اپنے عریضہ میں کیا، اجازت و مرضی معلوم ہو جانے کے بعد حضرت حکیم الامت سے درخواست کی جواب آیا "تعلیم کے زمانہ میں بیعت مناسب نہیں ہے" جواب پڑھ کر مایوسی ہوئی اور اسی مایوسی میں حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ

کو بھی ایک عریضہ تحریر کیا جسکا جواب سراپا تسلی یہ آیا کہ ’’آپ اپنے کو حضرتؒ ہی سے بیعت سمجھیں۔‘‘

پھر دوسری بار حضرت مصلح الامت کی خدمت میں حاضری فتح پور ۱۹۴۲ء کے تاریخی زمانہ میں ہوئی جس سے کچھ ہی قبل اسٹیشن کی سوختت اور لائنوں کی توڑ پھوڑ ہو چکی تھی اور اسکے بعض آثار اس وقت بھی موجود تھے۔ الہ آباد سے اندارا وہاں سے گھوسی وہاں سے براہ کار یساتھ فتح پور پہنچا۔ حضرت والاؒ کے مکان سے متصل جانب غرب مکتب کی عمارت میں قیام تھا، اس وقت علیحدہ سے خانقاہ کے نام سے کوئی عمارت نہیں بنی تھی۔ کھانے کا انتظام حضرت مصلح الامت کے دولت خانہ ہی سے تھا، حضرت کی نشست گاہ ہی میں ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا مجھے کھلا دیا جاتا تھا۔ چونکہ کوئی خادم وغیرہ مکان میں نہ تھا اس لئے حضرت والا ہی کو یہ زحمت اُٹھانی پڑتی تھی یعنی اندر سے کھانا حضرت ہی کو بہ نفس نفیس لانا پڑتا لیکن کرتا کیا مجبور تھا۔ بعد ظہر مجلس عام ہوتی جس میں قرب و جوار کے حضرات اور باہر سے آئے ہوئے مہمان شریک ہوتے، اشراق کے بعد بھی کبھی کبھی مجلس خاص ہو جاتی تھی بالکل وہی صورت تھی جو حضرت حکیم الامتؒ کی خانقاہ اشرفیہ میں دیکھی تھی۔

اس دفعہ حاضری شاید دو تین ہی دن کے لئے ہوئی تھی اس لئے جی چاہتا تھا کہ حضرت کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزرے چنانچہ حضرت والا سے مجلس اور اوقات حاضری سے متعلق معلوم کرنا چاہا تو فرمایا کہ تم دور سے تھوڑے وقت کے لئے آئے ہو جس وقت چاہو آجایا کرو چنانچہ دن کا اکثر حصہ حضرتؒ ہی کی خدمت میں گزرتا تھا۔

جب واپسی کا دن ہوا تو صبح حضرت نے نہایت شفقت و محبت کیساتھ ناشتہ کرایا اور واپسی کے سفر خرچ کے متعلق دریافت فرمایا کہ کرایہ ہے؟ پھر فرمایا کہ کتنے

روپے پاس موجود ہیں؟ احقر کے عرض کرنے پر جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ موجودہ رقم کرایہ کے لئے کافی ہے تو کوپا گنج کے ایک حاجی صاحب کے ہمراہ (غالباً حاجی سلیمان صاحب مرحوم تھے) مجھے رخصت کر دیا۔ میں کوپا گنج سے مؤ پھر وہاں سے الہ آباد چلا آیا۔

الہ آباد سے تال نرجا جانے والوں میں سبقت کا پہلو راقم سطور کے لئے مقدر ہو چکا تھا بعد میں تو الدال علی الخیر کفاعله کی صرف تسلی ہی بنکر رہ گیا۔

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، پی کر چلے گئے میں جا ہی ڈھونڈتا، تری محفل میں رہ گیا

میرے ساتھ تو حضرت اقدس کی یہ کرم فرمائیاں رہیں لیکن افسوس کہ اس ناکارہ (رومی) کا ساتھ محرومی نے نہ چھوڑا اسلئے عمل تو کچھ کر نہ سکا البتہ محبت اور تعلق کی وجہ سے امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آخرت میں اللہ تعالیٰ حضرت والاؒ ہی کے زمرہ میں محشور فرمائیں گے کہ المرء مع من احب ارشاد نبوی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کی قبر کو نور سے بھر دے۔ احقر نے حضرت سے سیکھا تو کچھ نہیں مگر ایک بار اُن کا یہ مجذوبانہ ارشاد شاید میرے لئے کچھ کام کر گیا ہو تو کر گیا ہو۔ فرمایا تھا رومی! رومی ہو جاؤ! احقر نے اوّلاً حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں اصلاحی تعلق کیلئے مکاتبت کی اور بیعت کی درخواست پر حضرت تھانویؒ نے اپنے مخصوص گیارہ مجازین کی فہرست (جو غالباً پیلے کاغذ پر چھپی ہوئی تھی) احقر کو بھیجی تھی چنانچہ احقر نے حضرت مصلح الامت کو حضرت مولانا تھانوی کا جواب اور اپنی بیعت کی خواہش لکھی تو حضرت والا نے تحریر فرمایا کہ آپ اپنے کو حضرت تھانوی ہی سے بیعت سمجھیں اور مکرر انکو نہ لکھیں۔ پھر حضرت تھانوی کے وصال کے بعد احقر کی درخواست پر بوقت تہجد اپنے دست حق پرست پر بیعت فرمایا اور تعلیم و تلقین فرمائی، الم یعلم بان اللہ یریٰ الآیۃ کا مراقبہ اور استحضار رکھنے کی ہدایت فرمائی اور دعا کی درخواست

پر فرمایا کہ میں خود اپنے لئے بھی یہی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بس اپنا ملازم رکھے اپنی مخلوق کی ملازمت (اور ان کے ساتھ نفسانی حرص و تملق کا تعلق) سے محفوظ رکھے۔ آپ اپنے لئے بھی یہی دعا کیا کریں اور میرے لئے بھی یہی کرتے رہا کریں۔ اللھم انی اسئلک الغنی عن الناس

احقر جس زمانہ میں فتح پور تال نرجا حاضر ہوا اس زمانہ میں محترم قاری صاحب اور مولوی قمر الزماں صاحب حضرت والا اور برادر محترم مولانا جامی صاحب کے پاس زیر تعلیم تھے، اسی زمانہ میں احقر نے حضرت کے بعض اصلاحی مضامین اور اصلاحی مکاتیب مرتب کر کے رسالہ کی شکل میں شائع کئے تھے مثلاً ''تلاشِ مرشد''، ''عاقبۃ الانکار'' ''ارشاد الطالب لنیل المطالب'' اور ''تعلیماتِ شیخ'' جو سب سے پہلے ماہنامہ ''الاحسان'' الہ آباد میں شائع ہوئے، اس کے بعد رسالہ ''معرفت حق'' ''وصیۃ العرفان'' میں اور ''تالیفاتِ مصلح الامت'' میں بھی شائع کئے گئے۔

حکیم الاسلام فخر الاماثل صدر الافاضل قاسم ثانی
حضرت قاری محمد طیب صاحب طاب اللہ ثراہ

غالباً موجودہ سنہ عیسوی کی چوتھائی دہائی کا چھٹا سال یعنی ۱۹۳۲ء کا زمانہ ہوگا اُس وقت احقر حفظ قرآن مجید سے فارغ ہو کر اُسکے دور کے دور ہی سے گزر رہا تھا، اُسی زمانہ میں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے خلیفہ حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ کے زیر اصلاح و تربیت محلہ ملاکہ کے ایک دولتمند تاجر نے اپنے محلہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کو وعظ و بیان کے لئے الہ آباد تشریف لانے کی زحمت دی تھی جسے آپ نے قبول فرما لیا اور اس وقت کی مروجہ ٹرینوں میں ایک مشہور ٹرین الیون اپ سے الہ آباد تشریف لائے تھے۔ یہ ٹرین اب

تک چل رہی ہے اور اس کے اوقات میں بھی شاید زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس وقت تو اسکی الہ آباد میں آمد دن میں نو دس بجے کے قریب ہوتی تھی، حضرت کے استقبال و خیر مقدم کرنے والے دوسرے بہت سے شہریوں کے ساتھ ایک نو عمر درجہ حفظ کا طالب علم بھی تھا جو اس وقت ابوالقلم بنا ہوا یادوں کے چراغ جلا رہا ہے۔ سردی کا موسم تھا حضرت قاری صاحب شاید ہلکے کتھئی رنگ کی چترالی عبا زیب تن کئے ہوئے تھے جس پر بنے ہوئے بیل بوٹے بھی اس وقت نظروں میں پھر گئے ہیں۔

اُس وقت حضرت کا حکیمانہ قاسمی انداز کا بیان تو خاک سمجھا ہوگا ہاں ان کا بارونق نورانی چہرہ اور وہ چترالی عبا، دل و دماغ میں ضرور ایسے مرتسم ہو گئے تھے کہ تقریباً پون صدی گزر جانے کے باوجود طاقِ نسیاں تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔

اس کے بعد بھی حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ والد صاحب علیہ الرحمہ کی دعوت پر دو چار بار اور بھی الہ آباد تشریف لائے، اس وجہ سے احقر نے تو اُنہیں اچھی طرح پہچان ہی لیا تھا اور کسی نہ کسی درجہ میں شاید حضرت کے ذہن کے کسی گوشہ میں کچھ دھندلی سی میری صورت بھی آ گئی تھی۔ پہلی ملاقات کے وقت اُن سے دعا کی درخواست اور والد صاحب کا اس طور پر میرا تعارف کرانا محفوظ رہ گیا کہ والد صاحب نے ملاقات کے وقت حضرت موصوف سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا تھا کہ ''یہ خادم زادہ ہے'' جس کا جواب موصوف نے بے ساختہ اپنے شایانِ شان یوں دیا تھا کہ ''مگر یہ تو مخدوم زادہ معلوم ہوتا ہے''۔

اس کے بعد ۱۳۶۳ھ میں جب دار العلوم دیوبند میں داخلہ کی ضرورت و نوبت آئی تو والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے اپنے قدیم تعلقات کی وجہ سے ایک خط لکھ کر مجھے دیا تھا جسکی وجہ سے حضرت پوری طرح احقر سے متعارف بھی ہو گئے تھے اور احقر بھی وقتاً فوقتاً حضرت موصوف کی ''مجلس طیب'' میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔

موصوف نمازِ مغرب میں بالعموم دار العلوم کی ہی مسجد میں امامت فرماتے تھے۔ ایک زمانہ میں عبید اللہ صاحب سندھی کے معتقد عنصر نے انکی آمد پر اُن سے "حجۃ اللہ البالغہ" پڑھانے کی خدمت لینا چاہی اور حضرت مہتمم صاحب کے دولت خانے پر اُن کا درس جاری ہوا۔ احقر بھی دو ایک بار حاضر ہوا تھا لیکن ان کی باتیں احقر کے پلے بالکل ہی نہ پڑتی تھیں اور اُن کے بعض طریقے عقل وفہم سے باہر ہی سمجھ میں آتے تھے اِس لئے حاضری بند کردی۔

یہ زبردستی کے جانشین شیخ الہند نماز ننگے سر پڑھتے تھے اور گرم چترالی عبا (اور کوٹ) بھی زیب تن فرمائے رہتے تھے۔ میں نے شریک حجرہ طلبہ سے اُن کے ننگے سر نماز پڑھنے پر ناگواری آمیز استفسار کیا تو ان کی عقیدتمندی کے جال میں پھنسے ہوئے ایک غازی پوری ساتھی نے جواب دیا کہ اُنہیں گرمی بہت لگتی ہے اِسلئے ٹوپی نہیں پہنتے، تو میں نے کہا کہ یہ کیسی سرگرمی ہے کہ صرف سر ہی کو لگتی ہے جو ہڈی کا ہے اور بدن کو سردی لگتی ہے کہ وہ ہر وقت چترالی عبا میں ملبوس رہتا ہے۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے دار العلوم کے زمانہ قیام میں شرف ملاقات تو برابر ہی حاصل ہوتا رہا تھا، ۱۳۹۲ھ میں یا اُس کے قریب ہی زمانہ میں جب بمبئی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا سب سے پہلے کنونشن ہوا تو احقر بھی اُس میں مدعو اور شریک ہوا تھا۔ اُس کے بعد غالباً بنگلور تشریف لے جاتے ہوئے آگرہ سے احقر کا سفر بھی اُسی ٹرین سے اور اُسی کوچ میں ہوا تھا جس میں حضرت صدرِ محترم حکیم الاسلام طاب اللہ ثراہ سفر فرما رہے تھے۔ دورانِ سفر حضرت نے خورد نوازی کے تحت یہ ارشاد فرما کر احقر کی جس انداز میں حوصلہ افزائی فرمائی تھی وہ میرے لئے ایک ناقابل فراموش یادگار فقرہ تھا جسے احقر یہاں سپردِ قلم کر کے اپنی یادوں کے چراغ کی روشنی اور اسکی ضیاپاشی کو مزید بڑھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا

تھا کہ "میں آپ کی تحریریں پڑھتا ہوں بلکہ مستفید ہوتا ہوں، ماشاء اللہ آپ کی گرفتیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔"

ناظرین تحریر کو اس موقع پر یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ احقر کے نقد و انتقاد کا دائرہ کچھ محدود نہیں تھا۔ اس نے آنموصوف کی کتاب "شہید کربلا اور یزید" پر بھی نقد و تبصرہ کرنے کی جرأت کر ڈالی تھی اور احقر کا یہ مضمون مرحوم عامر عثمانی صاحب کے مرحوم رسالہ تجلی کی تین قسطوں میں شائع ہوا تھا جس پر پاکستان کے مشہور مؤرخ و نقاد محمود احمد عباسی کے اظہارِ مسرت کے علاوہ ہندوستان کے بھی بڑے شیخ طریقت حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی نے احقر کو اپنی دعاؤں سے نوازا تھا۔ اِسی طرح حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے بھی تحسین فرمائی تھی، اللہ تعالیٰ نے احقر کو قلم سے وابستہ فرما دیا ہے جس کے اوّلین قدرداں حضرات اہل علم وفہم، اہل قلم ہی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر وہ لوگ ہیں جو علم کے قدرشناس اور تحریر سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جس طرح مجھے علامہ مودودی کی "ماڈرن رافضیت" سے اختلاف ہے اسی طرح علامہ محمود احمد عباسی کی "ماڈرن خارجیت" سے بھی اختلاف رہا ہے، چنانچہ میں دونوں ہی کو اس سلسلہ میں اپنا اختلاف واضح طور پر لکھ چکا ہوں۔

مکتوب طیب

برادر محترم عزیز مجد کم

سلام مسنون ودعاء مقرون

گرامی نامہ مع رسالہ گرامی (دیوبند سے بریلی تک) شرف صدور لایا جس کیلئے ممنون ہوں۔ سب سے پہلی ممنونیت تو یہ ہے کہ آپ نے اس ناچیز پر اعتماد فرماتے ہوئے اپنے بلند پایا افکار کے ذخیرے کو جوں کا توں میرے پاس ارسال فرما دیا۔ دوسری ممنونیت درحقیقت میرے واسطے سے پوری جماعت پر ہے کہ آپ نے پوری جماعت کی نمائندگی فرماتے ہوئے اکابر اسلاف سے مدافعت کا فریضہ انجام دیا۔ فجزاکم اللہ عناوعن جمیع المسلمین۔

کام بہت بڑا ہے جو حق تعالیٰ نے آپ سے لیا ہے اس کی مبارکباد عرض ہے۔

والسلام

محمد طیب مہتمم دارالعلوم، دیوبند

۱۳۸۴/۹/۲۸ھ

حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ

غالباً ۱۳۶۷ھ کے قریب کا زمانہ رہا ہوگا، احقر اُس وقت الٰہ آباد میں شیخ عبداللہ کی مسجد کی امامت اور کچھ ٹیوشن وغیرہ کرتا تھا۔ برادر محترم مولانا جامی صاحبؒ مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں مدرس تھے۔ اسی مدرسہ میں قاری بندہ الٰہی صاحبؒ اُن کے ساتھ تجوید پڑھاتے تھے، قاری صاحب نے بھائی جی کو خط لکھا کہ یہاں ڈابھیل کے مشہور مدرسہ اسلامیہ تعلیم الدین میں ایک مدرس کی ضرورت ہے آپ آنا چاہیں تو

آجائیں۔ بھائی صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ میں نے فوراً سفر کی تیاری کر لی اور راستے سے متعلق معلومات کر کے ڈابھیل کیلئے روانہ ہوگیا۔ ڈابھیل جانے کیلئے مرولی ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر بذریعہ بس ڈابھیل جانا پڑتا تھا، اسی راستے سے ڈابھیل پہنچ گیا اور قاری بندہ الٰہی صاحب نے مجھے آرام سے ٹھہرادیا اور پھر مہتمم مدرسہ مفتی اسمٰعیل بسم اللہ صاحب سے میری ملاقات کرائی، ملاقات کے وقت موصوف سے احقر کی جو گفتگو (یا بے ساختہ مکالمہ) ہوا وہ اس تحریر میں بھی آجائے تو شاید بعض ناظرین کو لطف بھی آجائے۔

مہتمم صاحب نے فرمایا کہ یہاں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے علاوہ چند مدرسین کے اسباق میں کمی کر کے ایک ایک سبق آپ کو دئے جائیں گے، میرے پاس سلم العلوم اور میبذی ہے، ان میں سے ایک کتاب آپ لے لیں، میں نے کہا سلم دے دیجئے، پھر بولے ایک مدرس کے پاس ابن ماجہ اور حسامی ہے ان میں سے ایک سبق لے لیجئے، میں نے کہا ابن ماجہ دے دیجئے، کہنے لگے کہ وہ حدیث کی کتاب ہے اور آپ ابھی نئے نئے فارغ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا حسامی دے دیجئے تو کہنے لگے کہ حسامی کے طلبہ اپنے اُستاذ (مولانا عبدالجبار اعظمیؒ) سے بہت مانوس ہیں، تو میں نے کہا پھر ابن ماجہ ہی دے دیجئے۔

بالآخر اُنہوں نے میرے لئے سلم، حسامی اور دیوان حماسہ تجویز فرمادیں اور کتب خانہ سے متعلقہ کتب نکلوا کر میں نے پڑھانا شروع کردیا۔ تقریباً ایک ہفتہ بعد میں ملاقات کیلئے دفتر اہتمام گیا تو مہتمم صاحب نے سوال فرمایا کہئے طلبہ مطمئن ہیں؟ میں نے کہا وہ اپنی بے اطمینانی مجھ سے تو ظاہر نہیں کریں گے، کہنے لگے کہ حسامی کے طلبہ کہہ رہے تھے کہ تقریر نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ آپ نے اُن کی اس بات کو کیسے معقول سمجھ لیا؟ تقریر تو تفسیر و حدیث سے متعلق کتابوں میں کی جاتی ہے،

اُصول فقہ کی کتاب میں کیا تقریر کی جائے۔ اُصول سمجھا کر دی ہوئی مثال اُر منطبق کر کے تفہیم عبارت کا کام پورا کر دیا جاتا ہے۔ وہ بیچارے میرے اس معق جواب کو سن کر خاموش ہی رہے اور دوسرے دن سے میں نے حسامی میں تقریر جھا شروع کر دی، جس کی وجہ سے سبق بہت تھوڑا ہی ہو سکا تو طلبہ نے کہا کہ حضرت ا رفتار سے کیسے کام چلے گا، ہمیں تو اِس کے بعد اسی گھنٹے میں شرح عقائد بھی آپ سے پڑھنی ہے۔ تو میں نے کہا کہ بھائی یا تو کتاب ختم کر لو یا تقریر سن لو۔ اُسکے ب میں نے پوچھا کہ مہتمم صاحب سے کس نے کہا تھا کہ حسامی میں تقریر نہیں کرتے؟ تو معل ہوا کہ ایک طالب علم نے کہا تھا۔ میں نے اُس سے بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟ اُس نے کہا شیطان نے بہکا دیا تھا، میں نے کہا کہ ایک پرچے پر لکھو کہ مجھ شیطان نے بہکا دیا تھا اس لئے مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، اُس نے پرچے پر یہی لکھ د میں نے وہ پرچہ اپنے پاس رکھ لیا اور اُس سے کہا کہ جاؤ اب شیطان نہیں بہکائے گا میں نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ شیطان کون تھا؟ مگر بعد میں مجھے معلوم ہو گیا ک وہ شیطان نہیں تھا بلکہ حسامی کے پہلے استاد تھے جنہیں غلطی سے اُن کے شاگرد نے شیطان قرار دے دیا تھا۔

اس موقعہ پر احقر تقریر کے مشاق اور خوگر مدرسین سے عذر خواہ ہونے ہوئے یہ بات لکھ دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ بے ضرورت طول طویل تقریریں اس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر مختصر تقریر کے ساتھ تفہیم عبارت پر اکتفا کرنا طلباء کیلئے مفید ہوتا ہے، احقر نے مظاہر علوم و دار العلوم میں جن حضرات اساتذہ سے پڑھا ہے اُن میں اُس وقت صرف ایک استاذ حضرت مولانا امیر احمد کاندھلویؒ تو ضرور تقریر کے عادی تھے لیکن اس کے باوجود تفہیم عبارت سے صرف نظر مطلق نہیں ہوتا تھا، احقر کو بھی یہی صورت زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے اس لئے احقر نے کہیں بھی

تدریس کے وقت محض تقریر کو معمول نہیں بنایا، سب سے پہلے مدرسہ عالیہ امدادیہ مرادآباد میں پڑھایا وہاں بھی اپنے علم و مطالعہ کی نمائش نہیں کی لیکن طلباء سبھی مطمئن اور خوش رہے، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں بھی اگر اُن استاد محترم نے حسامی کا سبق اپنے پاس واپس لینے کیلئے در پردہ بذریعہ طلباء وہ کوشش نہ کی ہوتی تو وہاں بھی یہ گل نہ کھلتا۔ حسامی کا سبق میرے پاس ہی رہا اور میرے ہی پاس کتاب ختم ہوئی تو میں نے طلباء سے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے پوری کتاب اچھی طرح سمجھ لی ہے کہیں کچھ کمی تو محسوس نہیں ہوئی؟ سب نے اقرار کیا کہ پوری کتاب سمجھ میں آ گئی ہے، تب میں نے کہا الحمد للہ! اب تم لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے مظاہر علوم میں صرف نورالانوار تک ہی پڑھا تھا، حسامی پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ حسامی وہاں اس وقت دورہ کے بعد فنون میں ہوتی تھی، اگر تم کو یہ بات پہلے بتلا دیتا تو تم لوگوں کی سمجھ میں پھر ایک سبق بھی نہ آتا کہ انہوں نے جب خود ہی حسامی نہیں پڑھی ہے تو ہمیں یہ کیا پڑھائیں گے مگر الحمد للہ کہ حسامی پڑھائی اور اِس کے بعد انہیں شرح عقائد بھی پڑھائی۔ ڈابھیل کی مدرسی اور وہاں کے خوش اخلاق احباب کی وجہ سے میرا ارادہ ڈابھیل چھوڑنے کا نہ تھا مگر وہاں کا قیام اِسی قدر مقدر تھا۔

ماکل ما یتمنی المرء یدرکه   تجری الریاح بما لا تشتهی السفن
ہر ایک دل کی تمنا ملا نہیں کرتی   کہ رُخ پہ کشتی کے ہر دم ہوا نہیں چلتی

ڈابھیل چھوٹنے کا غم اِس وجہ سے زیادہ محسوس ہوا کہ وہاں علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے ایک خاص شاگرد اور جامعہ ڈابھیل میں اُن کے صحیح جانشین یہی مولانا محمد یوسف بنوریؒ تھے جو مجھ سے محبت بھی فرماتے تھے اور اپنے ساتھ کچھ مناسبت بھی شاید محسوس فرماتے تھے جس کا اندازہ اِس بات سے بھی ہوا کہ اُن کے پاکستان چلے جانے کے بعد انہوں نے مجھ کو وہاں آنے اور اپنے مدرسہ میں پڑھانے

کی دعوت دی، میں اُس زمانہ میں مولانا عمر احمد عثمانی کی دعوت پر ڈھاکہ جاچکا تھا۔ وہاں ہمارے خاندان کے ایک عزیز بھی رہتے تھے، اُنہوں نے وہاں میزبان بننے کی پیشکش کر دی پھر میں نے سوچا کہ وہاں سے مغربی پاکستان چلا جاؤں گا لیکن پاسپورٹ میں کچھ ایسا قانونی چکر پڑ گیا جس نے مجھے چکر میں ڈال دیا کہ اِس پاسپورٹ سے مغربی پاکستان جانے کیلئے براہِ کلکتہ ہی جایا جاسکتا تھا اور مجھے مغربی پاکستان کا سفر کرنے کیلئے بمبئی تک پہنچ جانے کے بعد الہ آباد واپس آنا پڑا تھا۔

ڈابھیل کے زمانۂ قیام میں حضرت مولانا سیّد محمد یوسف صاحب بنوریؒ کی بے تکلف گفتگو کا ایک لطیفہ اگر یادوں کے اِس چراغ میں شامل کر دیا جائے تو شاید اِس کی روشنی میں کچھ نہ کچھ اضافہ تو ضرور ہی ہو جائے گا۔

ڈابھیل میں حضرات شیخین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے قیام کیلئے جو کمرے تعمیر کئے گئے تھے اُنہی میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور اُنکے ساتھ ایک دوسرے مدرس مولانا عبدالرؤف پشاوری کا قیام تھا، ان کمروں کے باہر نماز اور شام کی نشست کیلئے ایک چبوترہ اور اُسی پر جانب مغرب سیمنٹ کی ایک لانبی بینچ اور تپائی سی بنی ہوئی تھی جس پر ہم لوگ بعد نمازِ عصر جا کر بیٹھتے تھے، ایک روز مولانا بنوری وہاں تشریف لائے تو میں بینچ سے نیچے اُتر آیا اور مولانا کیلئے بینچ خالی کر دی، مولانا بیٹھنے کو تو بیٹھ گئے مگر احقر سے فرمایا کہ آپ نے میری پشت قبلہ کی طرف کرادی، میں نے بے تکلف عرض کیا کہ میں نے تو آپ کو اپنا قبلہ بنانا چاہا سو بنالیا۔ اس جواب سے حضرت مولانا بھی محظوظ ہوئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا کے ساتھ احقر کا قیام ڈابھیل میں تقریباً ایک سال رہا لیکن احقر کو اُن سے اور شاید ان کو بھی مجھ سے اُنس اچھا خاصا ہو گیا تھا، اسی بناء پر اُنہوں نے ٹنڈو الہ یار (سندھ) پاکستان آنے کی دعوت بھی دی تھی، اسی موقعہ پر

مدرسہ عالیہ امدادیہ مراد آباد کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد حیات صاحب سنبھلی رحمہ اللہ تعالیٰ

کا ذکر بھی یادوں کے چراغ کیلئے یقیناً حیات بخش ہوگا۔ مولانا موصوف میرے استاذ محترم حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری کے ہم سبق ہونے کی وجہ سے میرے لئے اُستاد جیسے ہی محترم تھے، وہ احقر سے بیحد شفقت و محبت اور بے تکلفی کا تعلق رکھتے تھے، ایک زمانہ میں موصوف مدرسہ امدادیہ کے مدرس اول اور احقر مدرس دوم تھا پھر جب اُنہوں نے اپنا علیحدہ مدرسہ حیات العلوم قائم فرمایا تو وہ وہاں بھی احقر کو اپنے مدرسہ میں مدرس و مفتی کی حیثیت سے رکھنا چاہتے تھے جس کیلئے اُنہیں میرے رفیق درس مولانا عاشق الٰہی بلند شہری علیہ الرحمہ نے اپنی جگہ رکھنے کا مشورہ دیا تھا اور مجھے اس سلسلہ میں خط بھی لکھا تھا لیکن اِسکی تقدیر میں اُس شہر کا قیام لکھا ہوا تھا جس کو دو چیزوں کی وجہ سے ہی جانا پہچانا جاتا ہے ایک تاجِ عمارات روضۂ ممتاز محل (تاج محل)، دوسرے پیٹھہ کا مربہ۔ مگر میں نے چندہ کرنے کی بیخ کی وجہ سے انکار لکھ دیا تھا۔ وکل شئی بقدر!

حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

احقر کے ''درسِ نظامی'' کی تعلیم کا آغاز و اختتام دونوں ہی مادرِ علمی مظاہر علوم سہارنپور ہی کے آغوشِ تعلیم و تربیت میں ہوا تھا اس وجہ سے دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ یا اُن کے قائم مقام و جانشین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادی دونوں میں سے کسی ایک سے باقاعدہ تلمذ کی نوبت تو نہیں آسکی جس کا کوئی ایسا تاثر محرومی بھی روحی کو بہرحال نہیں ہے کیونکہ اُن کے تلمذ سے احقر کی سند پر کوئی خاص نمایاں اثر بھی نہیں پڑا

لیکن حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ سے فی الجملہ تلمذ اس طور پر ضرور حاصل ہوگیا کہ جس سال احقر دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب علیہ الرحمہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھ رہا تھا حضرت مدنیؒ کی اسارت کی وجہ سے حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو مدرسۃ الغرباء، مسجد شاہی مرادآباد سے بلاکر دار العلوم دیوبند میں شیخ الحدیث و صدر مدرس کے طور پر مسند نشیں کیا گیا تھا۔

ہم طلبائے مشکوٰۃ شریف کی خواہش یہ ہوئی کہ مشکوٰۃ کی آخری حدیث شریف پڑھانے کیلئے حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب سے درخواست کی جائے جسے حضرت مولانا نے قبول فرمایا اور ہمیں آخری حدیث پڑھائی، اس طور پر احقر کو بھی حضرت موصوف سے تلمذ کا شرف تو حاصل ہو ہی گیا۔

آزادیٔ ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو تقسیم ہند اور تعمیر پاکستان کی جو سزا دی گئی اُسے تاریخ کے اوراق نے اپنے سینوں میں بھی محفوظ کرلیا ہے اور اُس کی یاد اپنے سینوں میں لئے کتنے ہی لوگ عالم بقاء کو سدھار گئے ہیں، اُسی زمانہ میں آزاد صاحب نے لکھنؤ میں آزاد تعلیمی کانفرنس کی صدارت فرماتے ہوئے جو یادگار خطبہ دیا تھا وہ بھی تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک قابل مطالعہ خطبہ ہے، اس کانفرنس میں شرکت کیلئے حضرت مہتمم صاحبؒ اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ بھی دار العلوم دیوبند سے تشریف لائے تھے، مظاہر علوم سے حضرت ناظم صاحبؒ، مولانا قدوسیؒ اور قاری سعید احمد صاحبؒ بھی شریک ہوئے تھے، احقر اُن دنوں لکھنؤ کے سنی کالج میں معلم تھا، کانفرنس کی بھیڑ بھاڑ میں خدا جانے کیسے حضرت مولانا سے بھی ملاقات ہوگئی تھی اور حضرت مولانا نے نہایت بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ فرمائش کی کہ بھائی یہاں کے کھانے میں تنوری روٹی ہوتی ہے تم اگر اپنے گھر سے چپاتی لے آؤ تو بہت اچھا ہو۔ بفضلہ تعالیٰ احقر نے اُنکی یہ فرمائش پوری کرنے میں دلی مسرت

محسوس کی، اپنے گھر سے ہاتھ کی پکائی ہوئی چپاتی لاکر پیش کردی، یہ بات تو یاد نہیں ہے کہ یہ چپاتی کتنی بار آئی تھی مگر اس وقت جب کہ ساٹھ سال پرانا واقعہ یادوں کے چراغ کی روشنی بڑھانے کیلئے قلمبند کر رہا ہوں دل میں ایک قسم کی مسرت کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں مدرسی کے زمانہ میں مولانا ہی کے پڑوس میں قیام تھا جس کی وجہ سے مولانا سے قرب و تعلق بڑھ گیا تھا۔

عم محترم حضرت سیّد عبدالرب صاحب صوفیؒ رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت والد صاحب جس زمانے میں فتح گڑھ میں تھے تو وہاں اسکول میں گیمس (کھیل) کی ساری ہی صورتیں اور سہولتیں موجود تھیں، اسکول بھی شہر سے باہر ہونے کے باوجود گھر سے کچھ زیادہ دور بھی نہ تھا، اس وجہ سے والد صاحب اسکول میں بعد نمازِ عصر ٹینس اور بیڈمنٹن وغیرہ نسبتاً ورزشی کھیلوں کے ساتھ ساتھ کیرم سے بھی وقت گزاری کرلیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں فتح پور کے گورنمنٹ اسکول میں عم محترم صوفی صاحب اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے مابین سخت چپقلش کی صورت پیدا ہوگئی اور ہیڈ ماسٹر کے کسی فقرہ پر مسلم طلبہ نے مشتعل ہوکر ہیڈ ماسٹر کی بری طرح پٹائی کردی، ہیڈ ماسٹر نے اسے صوفی صاحب کے زیرِ اثر و زیرِ اشارہ سمجھا اسکول بند ہوگیا اور تعلیمات کے افسران وہاں جمع ہوگئے، خسرو دربارِ اشرفی حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوبؒ اس وقت انگریزی اسکولوں کے انسپکٹر تھے وہ بھی تشریف لائے اور تعلیمات کے افسر اعلیٰ انگریز ڈائریکٹر کا فیصلہ یہ ہوا کہ اسکول کے پورے عملہ کا تبادلہ کردیا جائے، اسی تبادلہ کے موقع پر والد صاحب کو فتح گڑھ سے فتح پور تبدیل کیا گیا، فتح پور میں کچھ لوگ والد صاحب سے متعارف اور واقف تھے، اُنہوں نے صوفی صاحب کو بتایا کہ اب یہاں مولانا سراج الحق صاحب آرہے ہیں وہ ہیں تو مولوی اور دیندار لیکن تفریحاً کیرم بھی

کھیلتے ہیں، صوفی صاحب نے یہ سن کر والد صاحب کو خط لکھا اور انہیں کیرم کھیلنے کے معاملہ میں کچھ تبلیغی اور تنبیہی انداز اختیار کیا جس سے والد صاحب نے بھی اچھا ہی اثر لیا اور اس طرح دونوں کے درمیان رشتہ محبت ومودّت قائم ہوگیا اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک ہی سال میں یہ دونوں دوست سفر حج میں رفیق سفر بھی بن گئے اور اسی سفر میں دونوں کو حضرت مصلح الامت غریق بحر رحمت سے قرب وتعلق کا موقع ملا جس نے دونوں کو حلقۂ مریدین ومسترشدین میں یکجا ہونیکا موقع بھی فراہم کر دیا پھر بات یہیں پر ختم بھی نہیں ہوئی آگے بڑھ کر یہ نوبت بھی آگئی کہ مظاہر علوم سے میری تعلیم ختم ہونے کے فوراً بعد میری شادی کے نتیجہ میں یہ دونوں باہم سمدھی بھی ہوگئے۔

میری شادی تعلیم سے فراغت کے بعد بالکل متصلاً ہوئی تھی تاریخ عقد نکاح وغیرہ اسی لحاظ سے پہلے ہی مقرر ہو چکی تھی ۲۰ رشعبان کو سالانہ امتحان کا آخری پرچہ کر کے احقر ۲۱ رکو الہ آباد پہنچا اور اسی روز رات کو سیتاپور کیلئے روانگی ہوگئی، ۲۲ رکی صبح سیتاپور میں قیام رہا اور ۲۳ رشعبان کو بعد نماز جمعہ سیتاپور کی جامع مسجد میں عم محترم نے نکاح پڑھا دیا اور اسی روز بعد عصر رُخصتی ہوگئی، ۲۴ رکی صبح کو الہ آباد واپسی ہوگئی اور ۲۵ رشعبان کو ولیمہ ہوا جس میں صرف عزیزم صدیق عمر کی شرکت ہوئی تھی۔

رمضان المبارک میں بھی مجھے سیتاپور کا سفر کرنا پڑا تھا لیکن بفضلہٖ تعالیٰ سفر کی رُخصت پر عمل نہیں کیا تھا، سفر میں ٹرین پر ایک مسافر سے اسی موضوع پر دلچسپ گفتگو کی بھی نوبت آگئی تھی، انہوں نے خدا جانے کیوں یہ کہہ کر عمل رخصت کو بالکل ہی ختم کر دینے کی بات کہہ دی تھی کہ پہلے کے سفر دشوار ہوا کرتے تھے اب تو ٹرین اور دوسری آرام دہ سواریوں پر سفر ہوتا ہے، اب یہ رخصت باقی نہ رہنی چاہئے۔ بات کچھ بڑھ گئی تو انہوں نے عقل کی بات شروع کر دی اور بولے کہ تعلیم سے عقل بڑھتی ہے میں نے کہا کہ عقل تو نہیں بڑھتی ہے علم وتجربہ سے اسے استعمال کرنے کا طریقہ اور

سلیقہ آجاتا ہے مگر وہ کچھ کٹ حجتی پر آمادہ ہو گئے تو میں نے کہا کہ بات قاعدہ سے کیجئے۔ آپ پہلے عقل کی تعریف فرمادیں تو اندازہ ہو جائے کہ وہ بڑھ اور گھٹ بھی سکتی ہے یا نہیں؟ ڈبہ میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر ایک نوعمر لڑکے اور ایک معمر کی گفتگو دلچسپی سے سن رہے تھے تو ان مسافروں نے مزہ دار انداز میں چٹکی لیتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا کہ ''عقل ربڑ کو کہتے ہیں جو گھٹ اور بڑھ جاتی ہے''، بات ختم ہوگئی۔

جس زمانہ میں میری شادی ہوئی تھی اور جلد جلد میرا آنا جانا سیتاپور ہوتا رہا تھا صوفی صاحب اُس زمانہ میں سیتاپور میں رہنے والے ایک انگریزی داں ماسٹر صاحب کے ایک رسالہ کا جواب لکھ رہے تھے جو انگریزی زبان میں شائع ہوا تھا، ان ماسٹر صاحب نے حضرت اشرف العلماءؒ سے تعلیم واجازت کے باوجود پردہ کے خلاف ایک رسالہ لکھ دیا تھا، صوفی صاحبؒ اُسکا جواب لکھ رہے تھے تو احقر نے بھی اپنی بساط کے مطابق پردہ سے متعلق دلائل یکجا قلمبند کرنے میں اُنہیں کچھ مدد دینے کی کوشش کی تھی جس سے وہ خوش بھی ہوئے اور یہ اعتراف وتاثر بھی ظاہر کیا کہ میں بہرائچ میں بھی مولویوں کیساتھ رہ چکا ہوں مگر تم کو اُن مولویوں سے کچھ مختلف پاتا ہوں، اسی قسم کے الفاظ الہ آباد میں طبیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر حماد عثمانی نے بھی کہے تھے جب میں اُنکے کالج میں ہونے والے سالانہ امتحان میں نگرانی کر رہا تھا۔ بات کچھ بھی نہیں ہے حقیقت صرف یہ ہے کہ خاندانی اور باقاعدہ مہذب لوگوں کے بچے تو انگریزی اسکول کی نذر ہو جاتے ہیں وہ طبقہ عربی مدارس کا رُخ ہی نہیں کرتا اور بہت سے والدین جس لڑکے کو بالکل نکما اور ناکارہ دیکھتے ہیں اُسی کو حافظ اور مولوی ملا بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جیسی نیت ویسی برکت ظاہر ہے کہ بالکل بے ادب، غیر مہذب لوگوں کے غیر مرتب بچے جب بانیٔ مدرسہ، مہتمم وناظم اور رئیس الجامعہ بن جائیں گے تو اس کا نتیجہ اور حشر ظاہر ہے کہ کیا ہوگا؟۔

حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ

شمالی مشرقی یوپی کے چھوٹے سے مگر مشہور شہر ضلع پرتاپ گڑھ میں پھولپور کے رہنے والے مشہور بزرگ تھے، ان کی زیارت سب سے پہلے اپنے برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی علیہ الرحمہ کے عقد اوّل کے وقت پرتاپ گڑھ میں ہوئی تھی۔ پرتاپ گڑھ میں ہمارے پھوپھا پھوپھی رہتے تھے، انہی کی صاحبزادی مرحومہ سے بھائی جی کا نکاح ہوا تھا، یہ غالباً ۱۹۳۶ء کا زمانہ رہا ہوگا، حضرت والد محترم اور عم محترم حضرت سیّد عبدالرب صاحب صوفی علیہ الرحمہ نے مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی رفاقت ومعیت میں اسی سال پہلا حج کیا تھا۔

بھائی صاحب کے نکاح کیلئے حضرت والد محترم نے جن بزرگوار کو نکاح خوانی کیلئے زحمت دی تھی وہ یہی مولانا محمد احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھے، احقر نے حضرت کی زیارت پہلی بار اسی موقع پر کی تھی، اس کے بعد احقر کی خوش قسمتی سے جس محلہ بلکہ جس گلی میں ہم لوگ رہتے تھے اسی گلی کے ایک مکان میں حضرت علیہ الرحمہ کے ایک خصوصی مرید ومیزبان رہتے تھے جو ہم لوگوں کے رہائشی مکان کے مالک بھی تھے، اس وجہ سے حضرت سے بہت زیادہ قریب رہنے اور دیکھنے کے مواقع بہت کثرت سے ملتے رہے تھے۔ حضرت والا کو بھی احقر سے بہت محبت تھی، بڑی شفقت کے ساتھ پیش آتے اور کبھی کبھی کچھ نقد عطیہ سے بھی نوازتے تھے۔ احقر کی تحریریں شوق وذوق اور اہتمام سے پڑھتے اور مداح ودعاگو رہتے۔ احقر کی نکمی زندگی ہونے کے باوجود اگر کسی کو مجھ میں انس وتعلق کا کوئی پہلو نظر آتا ہے تو یقیناً وہ ایسے ہی باخدا بزرگوں کی نظر کیمیا اثر کا کرشمہ ہے۔

محی القرآن والسنہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ

احقر جب مدرسہ مظاہر علوم میں داخل ہوا تو موصوف دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوکر فنون کی کتابیں پڑھ رہے تھے اور معین مدرس کی حیثیت سے بعض ابتدائی اسباق بھی پڑھا رہے تھے، وہ عمر میں تو شاید احقر سے تین ہی سال بڑے رہے ہوں گے۔ موصوف کے جو حالات مطبوعہ کتابوں میں پڑھنے کو ملے ہیں ان سے ان کا سن پیدائش ۱۹۲۰ء (۱۳۳۸ھ) ظاہر ہوتا ہے۔ مظاہر علوم سے فارغ ہونے کے بعد اُنہیں مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تدریس کیلئے بلالیا گیا تھا لیکن وہ شاید وہاں کے نظم وانتظام سے زیادہ مطمئن نہ تھے کہ شہر فتح پور کے معروف مدرسہ اسلامیہ کیلئے احقر کے ابتدائی زمانہ کے استاد مولانا عبدالوحید صاحب صدیقیؒ نے اُنہیں بلالیا تو وہ بطور آزمائش وہاں محدود و مختصر رخصت لیکر چلے گئے تھے جہاں قیام شاید کچھ زیادہ ہوگیا تو جامع العلوم کے منتظمین کی طرف سے اُنہیں تحریر بھیجی گئی کہ اب آپ کی غیر حاضری سمجھی جائے گی اور ایام غیر حاضری کی تنخواہ دوچند وضع کی جائے گی۔ شاید اس سے مدرسہ والوں کا مقصد یہ رہا ہوگا کہ یہاں کے جتنے دنوں کی تنخواہ مدرسہ کے ذمہ آتی ہے وہ بھی اُنہیں نہ دی جائے۔ اہل انتظام کی یہ بات خلاف ضابطہ اور خلاف انصاف سمجھ کر مولانا نے کچھ ردوقدح شروع کردی جس کی اطلاع حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کو بھی ہوگئی، حضرت حکیم الامت بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے موصوف وہاں حاضر ہوئے، حضرت علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا کہ اہل علم کو عزت نفس کا خیال رکھنا چاہئے اُن کے لئے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ردوقدح کرنا اور چند روپیوں کیلئے بات بڑھانا مناسب نہیں، چنانچہ آپ نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ جامع العلوم کے بعد مولانا فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ میں کچھ ہی عرصہ رہے جہاں اُن کے بعد برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن جامی اور صدیق محترم قاری

صدیق احمد باندوی بھی مدرس رہے، رحمہم اللہ تعالیٰ۔ اسکے بعد مدرسہ اشرف المدارس اور مجلس دعوۃ الحق اپنے وطن ہردوئی میں قائم فرلیا جہاں ابتدائی خالص دینی تعلیم، تربیت اور بنیادی احیائے سنت کا ناقابل فراموش کام انجام دیا۔

مولانا موصوف سے آخر وقت تک احقر کے خوشگوار تعلقات رہے، والد محترم کے وصال پر احقر کو حضرت مولانا موصوف کے تعزیت نامہ سے بیحد تسلی ہوئی تھی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

صحبت کا اثر اور جمالِ ہمنشیں

ایک دن حمام میں اک دوست کے ہاتھوں مجھے
نکہت گل میں بسی پاکیزہ سی مٹی ملی
میں نے اس سے پوچھا، تو ہے مشک وعنبر یا عبیر؟
کیسی دل آویز خوشبو بھینی بھینی سی ملی
بولی وہ کچھ نہ تھی ناچیز سی مٹی تھی بس
پھول کی صحبت ملی، گل کی مجھے کیاری ملی
ایک مدت تک چمن میں ہمنشینِ گل رہی
ہمنشینی کیا ملی، پھولوں کی خوبو بھی ملی
ہوں وہی مٹی جو پہلے تھی کبھی بس خاکِ پا
بوئے گل مجھ میں بسی مجھ کو معطر کر دیا

اساتیذ اولی الالباب

اُستاذ الکل شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد عبداللطیف صاحب پورقاضویؒ

قدرے کشیدہ قامت، متوازن و معتدل چھریرہ بدن، مائل بہ سرخی و سپیدی رنگت، بارعب ومتانت، کتابی چہرہ، بے فرش وفروش، سادہ سی نشست گاہ اور چھوٹا موٹا گاؤتکیہ، گفتگو ہر طرح کے مزاح سے خالی، کوئی قریب سے قریب ہمہ وقتی خادم بھی ان سے بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا، جائے نشست پر نہ کوئی ڈیسک نہ کوئی باقاعدہ قلمدان، اہتمام وانتظام صرف ایک دوات میں سیاہ روشنائی اور ایک ہولڈر تھا جسے اپنی مستقل عادت کے مطابق ایک جملہ لکھنے کیلئے بھی دو تین بار دوات سے روشنائی پلاتے رہتے۔ بالعموم کاغذ ہاتھ پر ہی رکھ کر لکھنے کی عادت تھی، کاغذ تحریر کے نیچے کوئی دفتی وغیرہ رکھ کر لکھنے کا عام طور پر معمول نہیں تھا۔ موصوف میں نظم وضبط بالکل فطری انداز میں تھا۔ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ بھی اُنکے نظم وضبط کے قائل ومعترف تھے۔ یاد نہیں کہ اُن کے ہاتھ یا جیب میں کبھی کوئی گھڑی دیکھی گئی ہو لیکن وہ اپنے ہر کام کو ایک مقررہ وقت ہی پر کرنے کی عادت رکھتے تھے جو انکی طبیعت ثانیہ تھی۔ احقر نے حضرت موصوف سے بخاری شریف کا ایک معتد بہ حصہ پڑھا ہے، تقریر درس تفہیم حدیث ہی تک محدود ہوتی، وسعت نظر ومطالعہ کا اظہار کبھی محسوس نہیں ہوا، مگر سبق مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور پر مغز ہوتا تھا، لباس سادہ ہی ہوتا لانبا کرتہ اور مغلئی پاجامہ، سوتی اور گرم دونوں ہی قسم کی عبا موسم کے لحاظ سے برابر استعمال میں رہتی تھی، جمعہ کو نمازِ فجر اکثر دار الطلبہ قدیم کی مسجد کلثومیہ میں ادا فرماتے اور کبھی کبھی امامت بھی فرماتے، قرأت میں سورہ کہف کے واقعہ حضرت موسیٰؑ وحضرت خضرؑ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، شاید اس طرح طلباء کو اُستادی

وشاگردی کے حقوق وآداب کی تلقین کی نیت رکھتے ہوں۔ واللہ اعلم

حضرت ناظم صاحب علیہ الرحمہ کے اس تذکرہ میں ارباب مظاہر کی ایک "حکمت عملی" کا ذکر کر دینا بھی راقم شہادت حق کا تقاضا سمجھتا ہے کہ ہر ادارہ اور جمعیۃ وجماعت میں صدر وامیر کے صاحبزادگان کو اُن کے معتقدین میں کسی بھی طرح نظر انداز کرنے کی صورت اس وقت کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آرہی ہے مگر مظاہر علوم میں یہ صورت حال ہر حال دنیا نے دیکھ لی کہ حضرت استاذ الاساتذہ کے لائق وفائق صاحبزادہ گرامی قدر مولوی سید عبدالرؤف عالی کو دودھ کی مکھی کی طرح مدرسہ سے علیحدہ ہی رکھنا ضروری سمجھا گیا۔

افسوس کیسے کیسے سخنہائے گفتنی

خوف فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے!

حضرت الاستاذ الاکبر مولانا السید عبداللطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے صاحبزادہ گرامی قدر مولوی عبدالرؤف عالی سلمہٗ وزید مجدہٗ کی خواہش وفرمائش پر حضرت ناظم صاحب موصوف کا تذکرہ مع تبصرہ "ذکر لطیف وشریف" (مظاہر علوم سہارنپور کی ایک شریف ومظلوم شخصیت) چند سال قبل مستقل طور پر لکھ چکا ہوں، کسی قدر تفصیل اس میں آگئی ہے۔

اُستاذ الاساتذہ حضرت العلام مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوریؒ

مظاہر علوم سہارنپور میں برادر محترم مولانا عبدالرحمٰن جامی مرحوم ۱۳۵۵ھ میں پہنچ چکے تھے اور وہاں شرح جامی سے اپنی تعلیم شروع کر چکے تھے۔ اُس وقت والد صاحب کا قیام فتح پور میں تھا اور احقر نے حفظ قرآن مجید کے بعد مدرسہ اسلامیہ میں کچھ فارسی (گلستاں و بوستاں) پڑھ کر عربی کی بھی ابتدائی کتابیں میزان ومنشعب، پنج گنج، نحو میر، علم الصیغہ اور دروس الادب وغیرہ پڑھ لی تھیں۔

مظاہر علوم میں میری تعلیم شرح مأتہ عامل، فصول اکبری اور کبریٰ و نور الایضاح وغیرہ سے شروع ہوئی تھی۔ مظاہر علوم کے تقریباً سات آٹھ سالہ قیام کے دوران تمام اساتذہ میں مجھ کو غیر اختیاری طور پر سب سے زیادہ عقیدت اور کشش جن حضرات سے رہی ہے اُن میں سب سے نمایاں اور اعلیٰ شخصیت حضرت مولانا کامل پوریؒ ہی کی ہے۔ حضرت مولانا کا یہ وصف خاص میرے دل پر آج بھی نقش کالحجر ہے کہ وہ انتہائی متبحر عالم اور جامع معقول ومنقول ہونے کے باوجود حد درجہ متواضع بھی تھے، کسی وقت بھی اُن کی کسی بات یا کسی ادا سے کوئی شخص یا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اُن کے دل کے کسی گوشہ میں احساسِ برتری موجود ہے حالانکہ اُن کے تبحر اور استاذ الکل ہونے کی حیثیت مسلم تھی، احقر کے استاذ محترم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ اپنے شاگردوں کی موجودگی میں اپنی درسگاہ سے اُٹھ کر کتاب کے کسی مشکل مقام کو حل کرنے کیلئے بے تکلف اور بے جھجک حضرت کامل پوریؒ کی خدمت میں چلے جاتے تھے۔

اُستاذ محترم شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ اپنی علمی تصنیفات میں بے تکلف ان سے مراجعت فرما لیا کرتے تھے، اس کے باوجود وہ ان کی

تصنیفات کی بعض تحقیقات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے جس کا ایک بار تجربہ راقم سطور
بھی ان کے درسِ ترمذی میں ہوا ہے کہ احقر نے اپنی کسی بات کی تائید میں
اوجز المسالک کی ایک عبارت پیش کردی تو حضرت موصوف نے بہت ناگواری کے
ساتھ اُسے قبول کرنے سے انکار فرمادیا تھا اور فرمایا کہ مولوی صاحب! یہ بات تحریر
ہی میں دکھلادو۔

حضرت اُستاذ علام نوراللہ مرقدہٗ اپنے وقت کے ممتاز ترین، جامع معقول و
منقول استاذ تھے۔ استاذی حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ
فرماتے تھے کہ حضرت مولانا کامل پوریؒ اپنے وقت میں ترمذی شریف کے
عدیم النظیر استاذ تھے، اس وقت ان سے بہتر استاذ ترمذی کوئی اور میسر نہ تھا۔ مفتی
صاحب کی یہ بات اس لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اُس وقت دار العلوم دیوبند میں
بھی متعدد اُستادان حدیث موجود تھے۔

حضرت صدر المدرسین علیہ الرحمہ کی کم سخنی اور بحر ساں خموشی سے بھی دل و
دماغ متاثر ہیں۔ اوقات کے ایسے پابند اگر آپ چاہتے تو موصوف کی شب خیزی کے
وقت اوقات ساعت ملا لیا کرتے، ٹھیک ایک وقت پر روزانہ بعد قیلولہ قبل ظہر اپنے
حجرہ عزا سے باہر وضو کرتے دیکھے جاسکتے تھے۔

یہی حال شب کو تہجد خیزی کا بھی تھا۔ تقریر درس میں جس قدر متانت اور
جزالت ہوتی تھی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

عموماً یہ بات مشکل ہوتی ہے کہ آدمی درس حدیث کی مسند پر متمکن ہو اور
دوران تقریر دوسرے شراح حدیث وغیرہ پر کلام کرتے ہوئے اپنے بیان میں
خود پسندی و تعلّی کا شائبہ نہ آنے دے لیکن حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے یہاں یہ بات

نظر نہیں آتی تھی۔

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے متعلق بعض اساتذہ سے سنا ہے کہ شامی (ردالمحتار)
کا تین بار مطالعہ فرمایا تھا۔ حضرت شاہ انور صاحب کشمیری علیہ الرحمہ کی زبانی انکے تلامذہ
نے نقل فرمایا کہ صاحب ہدایہ کے بہت معتقد تھے۔ ہمارے حضرت مولانا کامل پوری
علیہ الرحمہ کا حال یہ تھا کہ ترمذی شریف کی تقریر میں دو شخصیتوں کا نام جس کثرت سے
آتا تھا شاید ہی کسی دوسرے کا آتا ہو۔ ایک تو شارح بخاری صاحب فتح الباری حافظ
ابن حجر، دوسرے شارح ہدایہ صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام، بلکہ احقر نے تو حضرت
مولانا کے سامنے جب بھی کوئی کتاب بہر مطالعہ دیکھی تو وہ فتح القدیر ہی ہوتی تھی۔

ایسا لگتا تھا کہ حضرت مولانا کو سب سے زیادہ یہی کتاب پسند ہو،
فرصت کے اوقات میں یوں ہی لیٹے رہنے یا بیٹھے رہنے کی عادت نہ تھی، اکثر مشغول
مطالعہ رہتے۔

اہل علم میں حسد معاصرین کا رذیلہ بری طرح سے اہل علم میں دکھائی دیتا
ہے۔ ممکن ہے کہ راقم کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہو، احقر اپنی کوتاہ نظری کا انکار تو نہیں کرسکتا
لیکن اپنے اندازہ و تجربہ کے غلط ہونے کی بات کو بھی آسانی سے قبول کر لینا آسان
نہیں سمجھتا، اِس کا صحیح اور قرار واقعہ فیصلہ تو اُسی روز ہوگا جس کے لئے یوم تبلی
السرائر جیسا بلیغ فقرہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل حضرتؒ
کامل پور (پاکستان) گئے ہوئے تھے، شاید دوبارہ تشریف بھی لانا چاہتے تھے مگر بعض
معاصرین کو ان کی واپسی پسند نہ تھی اس لئے انہوں نے مدرسہ سے اُن کا سامان ہی
اُن کے وطن واپس بھیج دیا، اس سے حضرت موصوف تو کسی نقصان اور گھاٹے کا شکار
نہ ہو سکے لیکن مادرِ علمی مظاہر علوم ضرور حضرت کی فیض رسانی سے محروم ہوگیا۔

احقر اس افسوسناک صورت حال سے متعلق اشاروں ہی میں صرف اسی قدر لکھنا مناسب سمجھتا ہے کہ اس تکلیف دہ صورت حال میں دونوں طرف احقر کے بعض اساتذۂ کرام ہی تھے۔ ایسے مواقع کیلئے میرے ایک قلندر صفت استاذ حضرت علامہ صدیق احمد صاحب کشمیریؒ بہت چست اور برمحل مقولہ سنایا کرتے تھے کہ

اِدھر قبلہ، اُدھر قبر، بیگم صاحبہ موتیں کدھر؟

اِس وقت احقر راقم سطور کیلئے بھی یہی کشمکش ہے، اگر ایک طرف حضرت مولانا کامل پوریؒ (جنہیں اُن کے شیخ و مرشد حضرت حکیم الامت ''کامل پورے'' فرماتے) ہیں جو احقر کے بلاشبہ عظیم المرتبت استاد ہیں تو دوسری طرف جن بزرگ نے اُن کا سامان اُن کے وطن بھجوا کر اُن کی دوبارہ واپسی پر روک لگانی چاہی تھی، وہ بھی احقر کے نہایت قابل احترام بزرگ ہی تھے، چنانچہ یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ مدرسہ مظاہر علوم ماضی کی اسی قسم کی نا انصافیوں اور بے اعتدالیوں کے نتیجہ میں پہلے ایک مدرسہ دو پر منقسم ہوا اُس کے بعد اِس کی تقسیم مزید کا دروازہ اور کشادہ ہو چکا ہے اور اب اس کا سلسلہ اور آگے بڑھتا نظر آرہا ہے۔

ایسی صورت میں موجودہ ذمہ دارانِ مدرسہ کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ ایک شاعر کا یہ شعر پیش کر کے اپنی پریشاں نویسی کو یہاں ختم کرتا ہوں۔

قریب یارو ہے روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

اُستاذِ محترم حضرت علامہ فہامہ اسعد اللہ صاحب اسعد رامپوریؒ

احقر جس روز مظاہر علوم میں داخل ہوا برادر مکرم مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کی معیت میں تھا، دارالطلبہ قدیم میں دارالحدیث کے نیچے سب سے پہلے جن بزرگ کی زیارت و ملاقات نصیب ہوئی وہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب دامت برکاتہم تھے۔ موصوف نے احقر کا نام دریافت فرمایا اور جواب میں نام معلوم ہوتے ہی یہ شعر ارشاد ہوا۔

اپنے مذہب کے دونوں حامی ہیں
ایک رومی ہیں ایک جامی ہیں

دوسرے روز پہلے گھنٹہ میں شرح مأتہ عامل پڑھنے کیلئے جن بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا وہ یہی بزرگ تھے لیکن یہ کل والے خوش مزاج شاعر حضرت اسعد نہ تھے، بلکہ مسند تدریس پر بیٹھنے کے بعد انتہائی خوفناک قسم کے مولوی صاحب میں تبدیل ہو چکے تھے۔ شرح مأتہ عامل کا پچھلا سبق مع عبارت و ترکیب سنا جا رہا تھا مجھ کو بھی نوٹس مل گیا کہ کل سے اسی طرح زبانی سبق سنانا ہوگا۔

اس جماعت میں کل سات آٹھ طالب علم رہے ہونگے۔ انہی میں ایک طالب علم ایسے بھی تھے جو اپنی پھول دار دلائی اور نرم روئی و کم گوئی کے باعث سب طلبہ میں ممتاز تھے، یہ تھے احقر کے از اول تا آخر ہم درس مولوی محمد یحییٰ سابق صدر مفتی مظاہر علوم۔

میرے دل و دماغ پر جن شخصیات کے تاثرات ہیں وہ گوناگوں جہتوں سے ہیں، دل و دماغ پر حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی ذہانت و حاضر دماغی اور تیز گوئی کا جو اثر ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

شرح مأتہ عامل میں حروف جارہ میں کاف تشبیہ کا بیان چل رہا تھا اور جو سبق

مجھے پہلے دن پڑھنا پڑا وہ یہ تھا وقد تکون زائدۃ نحو قولہ تعالیٰ لیس کمثلہ شئی کہ اس آیت میں کاف تشبیہ کے ساتھ مثل کا لفظ بھی آ گیا ہے اور ایک معنی کے لئے دو لفظ ایک ساتھ آئے ہیں، اس لئے کاف کو حرف زائد قرار دے دیا جو صرف حسن کلام کے لئے لایا گیا ہے۔ واللہ اعلم

حضرت استاد نحوی ترکیب کے ساتھ شرح مأۃ پڑھاتے تھے، چنانچہ پوری شرح مأۃ اسی طرح پڑھائی گئی تھی اور پچھلا سبق ترکیب کے ساتھ زبانی روزانہ سنا جاتا تھا جس کے نتیجہ میں جب یہ کتاب ختم ہوئی تو پوری کتاب ترکیب کے ساتھ یاد تھی اور ہر قاعدہ کے طالب علم کے لئے کسی بھی کتاب کو صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنا آسان ہو گیا تھا۔

شرح مأۃ ختم ہونے کے بعد ہدایۃ النحو شروع کرانے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے ابتدائی کتابیں بہتر طریقہ سے نہیں پڑھی ہیں اسلئے میزان سے لیکر شرح مأۃ تک کی کتابیں یاد کرو، اس کے بعد ہدایۃ النحو پڑھائی گئی اور اُس کے ختم ہونے پر نصاب سے آگے بڑھ کر مفید الطالبین بھی پڑھائی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب شرح جامی کا سبق مظاہر علوم کے امام النحو علامہ صدیق احمد کشمیریؒ کے پاس پڑھنے کی نوبت آئی تو انہوں نے فرمایا ''عبدالقدوس تو عبارت اچھی پڑھتا ہے'' ...... اس کے بعد احقر نے حضرت مولانا سے خارج اوقات میں شافیہ (کافیہ کی بہن) اور شرح وقایہ بھی پڑھی۔ اُس کے بعد ہدایہ اوّلین اور رشیدیہ اور دورہ حدیث شریف کے سال میں مسلم شریف بھی حضرت مولانا ہی سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس لئے اپنی تعلیمی صلاحیت حسب ظرف و استعداد جو کچھ میسر آئی۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا رحمہ اللہ کو مظاہر علوم میں اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتا ہوں۔ حضرت مولانا کے اہم واقدم تلامذہ میں حضرت مفتی جمیل احمد

صاحب تھانویؒ، قاری سعید احمد صاحب اجراڑویؒ، مولانا امیر احمد صاحب کاندھلویؒ اور مفتی محمود حسن گنگوہیؒ شامل ہیں۔

ایک موقع پر حضرت مولانا نے اپنے منظوم مکتوب گرامی میں احقر کو یہ شعر بھی لکھا تھا۔

میرے محترم مولوی رومی　　آپ دیکھیں نہ چہرۂ شومی

احقر نے بھی حضرت مولانا کے منظوم مکتوب کا جواب نظم ہی میں دیا تھا جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

بفیض حضرت اسعد ہے یہ سخن گوئی　　وگرنہ رومی ہے کیا اسکی گفتگو کیا ہے

احقر کی شاعری کی ابتداء مظاہر علوم کی طالب علمی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، جس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت مولانا دوپہر میں اپنے صاحبزادہ مولوی محمد اللہ مرحوم کو شرح مأۃ عامل پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز احقر بھی جا بیٹھا اور سبق کے دوران جو صورت حال پیش آئی اُس کو نظم کر دیا۔

میں جو پہنچا جناب کے کمرے　　دیکھا ساتھی بدن دباتے تھے
میں بھی آہستہ جا کے بیٹھ گیا　　پاؤں حضرت کے میں دبانے لگا
آپ دیتے تھے درس شرح مأۃ　　پڑھ رہا تھا فہیم و خوش طینت
بھول ہوتی نہ تھی قراءت میں　　میں بھی مشغول تھا سماعت میں
پھر اچانک وہ اک جگہ چوکا　　بعد تنبیہ بھی سنبھل نہ سکا
پھر تو مارا جناب اسعد نے　　جس کی تکلیف سے لگا رونے
پھر ہوئیں اور باتیں چند　　جو کہ تھیں شیرنی میں مثل قند
یہ سبب تھا خوشی سے پھول گیا　　اور اپنا رومال بھول گیا

یہ میری سب سے پہلی فی البدیہہ نظم تھی۔ ظہر کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کی؛ پڑھ کر مسکرائے اور محظوظ ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمہاری طبیعت کو نظم سے مناسبت معلوم ہوتی ہے اگر تم شاعری نہ کروگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔ وقد صدق ظنہ (یہ وہی بات ہے جو استاد غالب نے اپنے شاگرد حالی سے کہی تھی)

احقر کی تعلیمی زندگی کے سات سال مظاہر علوم میں گزرے ہیں اور اس مدت کا کافی وقت حضرت مولانا رحمہ اللہ کی خدمت میں ہی گزرتا تھا۔ حضرت استاد محترم کو تصحیح لغت اور تصحیح تلفظ و املا کا بہت اہتمام تھا۔ اس سلسلہ میں وہ شرح مأۃ عامل کی عبارات کی ترکیب کے "جملۂ خبریہ" کہنے میں باء کے فتح کو نمایاں کرکے "جملۂ خبَریہ" کہلانے پر بہت سختی کرتے تھے جب کہ عام طور پر طلبہ "جملۂ خبْریہ" سکونِ باء کے ساتھ بولنے کے عادی ہوتے ہیں۔

اسی طرح لفظ مقصد کو بکسر صاد مقصِد ہی کہتے تھے کیونکہ مضارع مکسور العین سے اسم ظرف مفعل بکسر عین ہی آنا چاہئے۔

اسی طرح اُن کی تحقیق یہ بھی تھی کہ لفظ "تنقید" تفعیل کے باب سے عربی میں مستعمل نہیں ہے، یہ عربی سے نابلد اُردو والوں نے باب تفعیل سے زبردستی بنالیا ہے، عربی زبان میں یہ مادہ صرف ثلاثی مجرد اور باب افتعال ہی سے آیا ہے، نقد اور انتقاد یہی دو لفظ عربی میں مستعمل ہیں اور جب لفظ تنقید عربی زبان کا لفظ نہ ہوا بلکہ اُردو زبان کا لفظ قرار دیا گیا تو دوسرے عربی الفاظ کے ساتھ اسکی ترکیب اضافی بھی صحیح نہ ہوگی۔

اس روشنی میں "تنقیدی اشارے" کو صحیح کہا جائے گا لیکن مبادیات تنقید کو صحیح کہنے میں اختلاف کی گنجائش کا انکار یقیناً صحیح نہ ہوگا کیونکہ جب لفظ تنقید عربی

زبان کا نہیں ہے تو دوسرے عربی لفظ سے اسکی ترکیب اضافی کو قبول کرنے پر کسی کو مجبور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ دعائے گنج العرش کی ترکیب بھی یقینی طور پر محل غور و تامل کہی جاسکتی ہے لیکن ایک زمانہ سے رواج پالینے کے بعد اسے ختم کرنے کی اپیل کرنا بھی کوئی مفید و کارآمد اپیل نہ ہوگی۔

حضرت استاذ رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مأۃ عامل پڑھاتے وقت ضمیر جس لفظ کے لئے لائی گئی ہے اُسے ضمیر کا مرجِع بکسر عین ہی کہتے تھے اور مرجَع بفتح عین جو عام طور پر طلبہ بولتے ہیں اسے غلط ہی قرار دیتے تھے، قرآن مجید میں بھی ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُهُمْ ہی آیا ہے۔

حضرت استاد جو کہ شاعر بھی تھے اسلئے اُردو کے شعراء بھی ان سے ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے۔ میرٹھ کے ایک شاعر تسکین میرٹھی مرحوم جو محکمہ پولس کے افسر تھے وہ بھی آتے تھے، ایک بار انہیں کے ساتھ ہندوستان کے مشہور غزل گو شاعر حضرت جگر مراد آبادی مرحوم کو لے کر مولانا سے ملاقات کرانے مظاہر علوم میں لے آئے۔ حضرت مولانا نے مدرسہ کے دار الطلبہ قدیم کی دار الحدیث میں ان حضرات کے بیٹھنے کا نظم کیا۔ احقر نے سب سے پہلے حضرت جگر کو اسی وقت دیکھا اور ان کی مترنم غزل گوئی سننے کا موقع ملا تھا۔ جگر صاحب نے اپنی یہ تازہ غزل سنائی تھی۔

جلوہ بقدر ظرف نظر دیکھتے رہے، کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے
اُن کی حریم ناز کہاں اور ہم کہاں، نقش و نگار پردہ و در دیکھتے رہے

اسی شعر کو ایک بار پڑھ کر جگر صاحب نے یہ بات واضح کردی کہ میں لفظ حریم کو مونث ہی استعمال کرتا ہوں، احقر راقم سطور موصوف کی اس بات کو ان کی تعلّی بیجا پر ہی محمول کرسکتا ہے وہ خوش آواز اور خوش لہجہ شاعر تو ضرور مشہور تھے مگر انہیں

استادِ فن کا مقام حاصل نہیں تھا۔ اس قسم کا دعویٰ تو حضرت اصغر گونڈویؒ نے بھی شاید نہ کیا ہو جنہیں خود جگر صاحب استاد کی طرح جانتے اور مانتے تھے۔

حریم حسن معنی ہے جگر، کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہوکر، تو اُٹھو باخبر ہوکر

جگر صاحب کے معاصر شعراء میں نوح ناروی اور حسرت موہانی اور سیماب اکبر آبادی جیسے شعراء اس قسم کی بات کہتے تو قابل قبول اور لائق اعتنا ہوسکتی تھی۔ بات موضوع سے نکلی جا رہی ہے ورنہ تذکرہ تو حضرت استاد علامہ اسعد علیہ الرحمہ کا ہو رہا تھا اور یہ بات چل رہی تھی کہ حضرت کی خدمت میں شہر کے شعراء بھی آیا کرتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت استاد کی خدمت میں کہیں سے ایک شاعر تشریف لائے تھے اور اپنے کلام سے حضرت کو محظوظ فرمایا تھا، استاد محترم کو ان کے سنائے ہوئے بعض اشعار بہت پسند آئے تھے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

مے تو پی لیتا ہوں لیکن محتسب کا ڈر بھی ہے نفس کے بندے کو خوفِ داورِ محشر بھی ہے
قدم سوئے مرقد، نظر سوئے دنیا کہاں جا رہا ہوں؟ کدھر دیکھتا ہوں؟

حضرت اسعد، اصغر صاحب سے اور اُن کی شاعری سے شاید اُس وقت تک زائد واقف نہ تھے کیونکہ اصغر صاحب مشاعرہ کے شاعر نہیں تھے۔ ایک بار احقر نے اصغر صاحب کا ایک شعر اُن کے سامنے پڑھ دیا تو حضرت پر جیسے وجد سا طاری ہو گیا اور اپنے خاص انداز میں اسے بار بار دہراتے رہے۔ شعر یہ تھا

اصغر مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے
گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

ایک دوسرے موقع پر احقر نے اصغر کا یہ شعر پڑھ دیا جو خود مجھے بہت پسند تھا۔

رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

حضرت مولانا نے یہ شعر سن کر تحسین کے بجائے تنقید فرمادی کہ چمن کا لفظ اسم ظاہر کے طور پر پہلے مصرع میں آ گیا ہے لہٰذا دوسرے مصرع میں اسم ظاہر کے بجائے ضمیر آنا چاہیے تھی۔

حضرت اسعد کی یہ مدرسہ والی موشگافی کے انداز کی تنقید مجھے حضرت اصغر کے شعر پر کچھ اچھی نہ لگی کیونکہ لغوی حیثیت سے چمن اور گلستاں کے مصداق بھی الگ الگ ہیں، اسلئے اس میں تکرار لفظی و معنوی کا اشکال نہیں ہوسکتا، میں حضرت سے کچھ شوخ بھی تھا فوراً ہی یہ بات زبان سے نکل گئی کہ حضرت! ''اس شعر پر تنقید تو آسان ہے مگر ایسا شعر کہنا مشکل ہے۔''

ظاہر ہے کہ حضرت کو احقر کی یہ صاف گوئی ذرا ناگوار محسوس ہوئی مگر احقر کی یہ معروض حضرت کے نزدیک بھی مبنی بر حقیقت ہی تھی کہ شعر گوئی کے مقابلہ میں تنقید تو آسان ہے ہی۔ بات یہ چل رہی تھی کہ حضرت استاد کی خدمت میں شہر کے بعض شعراء بھی حاضر ہوتے رہتے تھے، ان میں سے بعض تو غیر مسلم (ہندو) بھی ہوتے تھے۔ ایک بار ایسے ہی ایک شاعر سادھو رام آرزو آئے اور انہوں نے اپنا ایک شعر سنایا۔

کمی دیکھئے آ نہ جائے جفا میں...... یہ میرا نہیں آپ کا امتحاں ہے

حضرت استاد نے برجستہ فرمایا کہ آ نہ جائے کے بجائے رہ نہ جائے کہئے یعنی

کمی دیکھئے رہ نہ جائے جفا میں...... یہ میرا نہیں آپ کا امتحاں ہے

کیونکہ کمی آتی نہیں بلکہ رہ جاتی ہے، اس کے مقابل زیادتی آتی ہے۔

حضرت استاد رحمہ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً عربی، فارسی اور اُردو کے بعض اشعار سناتے تھے جو اتنی طویل عمری میں پوری طرح اب دماغ میں محفوظ بھی نہیں رہ سکے ہیں۔ (البتہ میری بیاض میں بعض اشعار اُسی وقت کے قلمبند کیے ہوئے محفوظ رہ گئے ہیں)

کبھی کبھی ایک شعر یہ سنایا کرتے تھے کہ

ہم بھی کھنچے کھنچے رہے وہ بھی کھنچے کھنچے
اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

یہ شعر میں نے مظاہر علوم کی چپقلش شروع ہوتے وقت صاحبزادۂ محترم مولوی محمد اللہ مرحوم اور مفتی مظفر حسین مرحوم دونوں ہی کو سنایا تھا۔ دونوں نے یہ برمحل شعر سنا اور سنانے کا مقصد بھی سمجھ گئے مگر مسکرا کر رہ گئے۔

بڑا مزہ ہو کہ ہم بات بات پر روٹھیں
وہ بار بار کریں کوششیں منانے کی
مزہ آتا اگر گزری ہوئی راتوں کے افسانے
کہیں سے تم بیاں کرتے، کہیں سے ہم بیاں کرتے

یہ شعر حضرت مولانا نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا تھا چنانچہ میں نے اپنے ایک شاگرد کو یہ شعر سنایا تو اس نے بھی اسی مضمون کا ایک شعر سنا دیا جو بہت اچھا ہے۔

تم بھی جو کہتے جاؤ تو یاد آتے جائیں گے
ٹکڑے جو میری بھولی ہوئی داستاں کے ہیں

اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمین میں کبھی داغؔ و امیرؔ کے زمانہ میں شاید مشاعرہ

ہوا ہو، جس میں سے داغؔ کی غزل دیکھنے کو ملی ہے۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
کب مجھ سے چھپ سکیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

یہ بعض اشعار اُردو کے جو کسی طرح سر سر نسیاں کے جھونکے سے بچ کر محفوظ خانۂ دماغ میں چھپ کر بچے رہ گئے تھے اور اس وقت قلم کی زبان سے ظاہر ہو سکتے تھے اُنہیں قلم یہاں سپرد قرطاس کیے دیتا ہوں۔

وتشبهو ان لم تكونوا مثلهم   ان التشبه بالكرام فلاح
فسوف ترى اذانكشف الغبار   افرس تحت رجلك ام حمار
اذا ذهب العتاب فليس ود   ويبقى الود ما بقى العتاب
ماكل ما يتمنى المرء يدركه   تجرى الرياح بما لا تشتهى السفن
طرق العشق كلها آداب   ادبوا النفس ايها الاصحاب
تقول وفى قولها حكمة   اتبكى بعين ترانى بها
جنية اولها جن يعلمها   رمى القلوب بقوس مالها وتر
الم يرضك الرحمن فى سورة الضحىٰ   فحاشاك ان ترضىٰ وفينا معذب
يطول اليوم لاالقاك فيه   وحول نلتقى فيه قصير
بئس المطاعم حين الذل تكسبها   القدر منتصب والقدر مخفوض
تمتع من شميم عرار نجد   فما بعدالعشية من عرار
ماان مدحت محمداً بمقالتى   لكن مدحت مقالتى بمحمد
ولولا الشعر بالعلماء يزرى   لكنت اليوم اشعر من لبيد
المت فحيت ثم قامت فودعت   فلما تولت كادت النفس تزهق

اذ المرء لم يدنس من اللوم عرضه فكل رداء يرتديه جميل
اجد الملامة فى هواک لذيذة حب الذكرک فليلمنى اللوم
الحبه واحب فيه ملامة ان الملامة فيه من اعدائه
اذا قبح البكاء على قتيل رائت بكائک الحسن الجميلا
ايها القوم الذى فى المدرسة كل ماحصلتموه وسوسه
ومن يتق الله يجعل له ويرزقه من حيث لا يحتسب
هو الحبيب الذى ترجى شفاعتهٗ لكل هول من الاهوال مقتحم
لا يسئلون اخاهم حين يندبهم فى النائبات على ماقال برهاناً
ومن لا يذد عن حوضه بسلاحه يهدم ومن لا يظلم الناس يظلم
اصبر قليلا فبعد العسر تيسر وكل امر له وقت وتدبير
وللمهيمن فى حالاتنانظر وفوق تدبيرنا لله تقدير
من كان منفتخراً بالمال و النسب فانما فخرنا بالعلم و الادب
ليس الجمال باثواب تزييننا ان الجمال جمال العلم والحسب
وحدة الانسان خير من جليس السوء عندهٗ وجليس الخير خير من جلوس المرء وحده
لا تزر من تحب فى كل شهر غير يوم وتزده عليه
فاجتلاء الهلال فى الشهر يوما ثم لا تنظر العيون اليه

وقال آخر بعكس ماتقدم

اذا حققت ودا من صديق فزره ولاتخف منه ملالا
وكن كالشمس تطلع كل يوم ولاتک فى مودته هلالا
انما الدنيا فناء ليس فى الدنيا ثبوت
انما الدنيا كبيت نسجته العنكبوت

ولقد يكفيك منها ايها الطالب قوت
ولعمرى عن قريب كل من فيها يموت

ایک مرتبہ حضرت استاد نے ایک آریہ پنڈت سے مناظرہ کے وقت کچھ اُس پر طنز کے ارادہ وخیال سے یہ شعر پڑھا تھا

وائے ناکامی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حضرت مولانا کو کچھ سردی کے اثر سے بخار اور نزلہ کی کیفیت تھی چنانچہ احقر سے فرمایا کہ مناظرہ کرنا طے کیا جا چکا ہے اس لئے اُسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا تم میرے ساتھ چلو اگر ضرورت ہوئی تو اپنی طرف سے مناظرہ کرنے کے لئے تمہیں پیش کر دونگا مگر وہاں اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور حضرت مولانا نے اپنی ذہانت اور حاضر جوابی سے مقابل کو ساکت وصامت کر دیا اور مناظرہ ختم ہو گیا۔ وہ لطیفہ بھی سن لیجئے کہ مناظرہ کیسے ختم ہو گیا۔ مد مقابل نے کوئی اعتراض کیا، مولانا نے بے ساختہ فرمایا کہ آپ اپنا اعتراض لکھ کر دے دیجئے۔ وہ بیچارہ یہ سمجھا کہ میری بات غلط یا اعتراض میں کچھ کمزوری ہے اس لئے وہ لکھ کر دینے کیلئے تیار نہ ہوا اور مولانا کو اُس کی یہ کمزوری ہاتھ آ گئی اور بات ختم ہو گئی۔ واپسی پر احقر نے مولانا سے دریافت کیا کہ کیا اُس کا اعتراض صحیح نہیں تھا؟ ہنسے اور فرمایا کہ مجھے اُس وقت اس کا جواب مستحضر نہیں تھا مگر چور کی داڑھی میں تنکا وہ غریب یہ سمجھا کہ میرا اعتراض ہی غلط ہے اور لکھ کر دینے کیلئے آمادہ نہ ہوا۔ ایک مرتبہ سہارنپور میں حضرت مولانا کی معیت میں ایک بین المذاہب اجتماع میں بھی شرکت کا موقع ملا، وہاں اناؤنسر صاحب نے سب سے پہلے مولانا ہی کو دعوت دی کہ وہ تشریف لائیں اور اسلام کا پرچہ (تعارف)

کرائیں۔(تاکہ بعد میں تقریر کرنے والوں کو مولانا کی بات کی تردید کرنے کا موقع مل سکے) اُس نے اپنی تمہید میں یہ بھی کہا کہ اِس وقت ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ تمام دھرموں کے ودوان یہاں تشریف فرما ہیں اور ہم سب حق کی تلاش میں یہاں جمع ہوئے ہیں۔حضرت مولانا اناؤنسر صاحب کی دعوت وفرمائش پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ آپ سب حضرات کو میں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ سب حضرات یہاں حق کی تلاش میں تشریف لائیں ہیں، مجھے اِس پر بے حد خوشی اور مسرت ہوئی مگر میں خود حق کی تلاش میں نہیں آیا بلکہ الحمد للہ حق پہنچانے آیا ہوں۔جن حضرات کو حق کی واقعی تلاش ہے اُن کو میں حق پہنچانا چاہتا ہوں۔یہ فرما کر اسلام کا جامع تعارف کرایا۔حق بات کہنے والے نے کہہ دی اور سننے والوں پر جو گزرنی تھی وہ گزر گئی۔

استاذ محترم شیخ الحدیث صاحبؒ کی خصائل نبویؐ (شرح اُردو شمائل ترمذی) جب چھپی تو حضرت مولانا نے اپنے ناقدانہ اصلاحی مزاج ومذاق کے مطابق فرمایا کہ خصلۃ کی جمع خصال آتی ہے، خصائل نہیں آتی، یہ تو خصیلۃ کی جمع ہے جس کے معنیٰ بالوں کے گچھے کے ہیں۔خصلۃ کے معنیٰ عادت کے ہیں ع حسنت جمیع خصالہ
خصائل کو شمائل پر قیاس کرنا صحیح نہیں، شمائل شملۃ کی جمع نہیں بلکہ شمیلۃ کی جمع ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا کے پاس ایک ہندو لڑکا آیا اور کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔حضرت مولانا نے اُس کو مسلمان ہونے کا طریقہ بتلا دیا، وہ مسلمان ہوگیا۔اُس کے بعد اُسی لڑکے کا بھائی بھی آیا اور وہ بھی مسلمان ہوگیا۔یہ صورت حال دیکھ کر اُن دونوں بھائیوں کی ماں نے تھانہ میں رپٹ لکھوادی کہ مدرسہ کے ایک مولوی صاحب نے ہمارے دولڑکوں کو مسلمان کرلیا ہے، چنانچہ تفتیش کیلئے محکمہ پولس یا

خفیہ پولس کا ایک آدمی سادی وردی میں آیا اور دارالطلبہ قدیم کے صدر دروازہ پر آکر دریافت کیا کہ یہاں کوئی مولوی اسعد اللہ رہتے ہیں۔اتفاق سے مولانا اُسی وقت دروازہ سے نکل رہے تھے، فرمایا جی ہاں! فرمایئے۔اُس نے پوچھا آپ ہی مولوی اسعد اللہ ہیں۔مولانا کا جواب اِثبات میں سنکر اُس نے پوچھا کہ آپ نے دو ہندو لڑکوں کو مسلمان کیا ہے؟ مولانا نے برجستہ جواب دیا جی نہیں! مسلمان تو آدمی خود ہوتا ہے کوئی کسی کو مسلمان نہیں کرسکتا۔اُس نے کہا کہ اِن لڑکوں کی ماں تو آپ کا نام بتلا رہی ہے۔مولانا نے فرمایا کہ میرے پاس دو لڑکے یکے بعد دیگرے آئے تھے اور اُنھوں نے مجھ سے مسلمان ہونے کا طریقہ دریافت کیا تھا، میں نے اُن کو اسلام لانے کا طریقہ بتلا دیا تھا، باقی میں نے مسلمان اُن کو نہیں بنایا ہے بلکہ وہ خود بلاجبر و اکراہ از خود مسلمان ہوئے ہیں۔مولانا کا یہ مسکت اور اُصولی جواب سنکر وہ مبہوت و حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ پھر میں کیا جواب دوں۔مولانا نے فرمایا یہی جواب دے دیجئے جو میں نے آپکو دیا ہے۔وہ یہ جواب سنکر واپس چلا گیا اور بات ختم ہوگئی۔

یہ دونوں بھائی عبدالرحمٰن اور مولوی عبدالرحیم (ساکن محلہ بنجاران) سہارنپور ہی میں رہتے تھے۔حضرت مولانا کے بعض علمی اور ادبی افادات "صحائف اسعد" (مرتبہ تسکین میرٹھی) میں چھپ چکے ہیں۔حضرت استاد موصوف کا جو محققانہ، مدققانہ اور ادیبانہ، شاعرانہ، ناقدانہ اور مناظرانہ انداز تھا وہ مظاہر علوم میں اُن ہی پر ختم ہوگیا۔نور اللہ مرقدہٗ

استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی قریب سے زیارت اور ان کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضری ۱۹۴۲ء میں ہندوستان کی تحریک آزادی کو موثر اور زور دار بنانے کے لئے حکومت برطانیہ کے خلاف ایک تخریبی قدم ریلوے اسٹیشنوں کو جلانے اور ریلوے لائینوں کو اکھاڑنے کی شکل میں ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں کانگریس کے تمام بڑے لیڈران گرفتار کر لئے گئے تھے، اسی سلسلہ میں حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمہ کی بھی گرفتاری سہارنپور کے قریب اسٹیشن ٹپری پر ہوئی تھی۔ یہ خبر تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کو بعد ظہر کی مجلس عام میں کسی شخص نے دی تھی، حضرت کی اس مجلس میں احقر راقم سطور بھی موجود تھا اور مدرسہ کے ایک دوسرے طالب علم صوفی نذیر احمد سیالکوٹی بھی موجود تھے۔ (ہم دونوں کبھی کبھی تھانہ بھون پیدل بھی جاتے تھے)

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کو حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی گرفتاری کی خبر سن کر سخت دھکا لگا اور کچھ دیر تک سر پکڑ کر رنجیدہ و غمزدہ انداز میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔۔۔ کچھ دیر کے بعد کچھ سنبھلے تو نہایت تاثر کے ساتھ فرمایا کہ اس وقت یہ خبر سن کر میرے دل کو ایک دھکا لگا، سیاسی اختلاف کی وجہ سے جو دوری آپس میں پیدا ہو گئی تھی اس کی وجہ سے میں یہ سمجھتا تھا کہ شاید ہمارے درمیان ربط و محبت کا تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے لیکن اس وقت پتہ چلا کہ ہمارے درمیان محبت و تعلق بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔ (اصل واقعہ یہ ممکن ہے کہ اس سخت زمانہ کے بعد کوئی اختلاف بدل گیا ہو لیکن حضرت والا کے ارشاد [illegible] [illegible])

خانقاہ تھانہ بھون سے مظاہر علوم واپس آنے پر جب حضرت شیخ الحدیث

رحمہ اللہ تک اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مظاہر علوم کے دو طالب علم صوفی نذیر احمد سیالکوٹی اور عبد القدوس رومی الٰہ آبادی بھی اس مجلس میں موجود تھے اور ان دونوں نے بھی حضرت کا یہ ارشاد سنا ہے تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے ہم دونوں کو علیحدہ علیحدہ بلا کر اس واقعہ کی حکایت سنی اور اسے اپنی ذاتی بیاض میں درج فرمالیا۔

حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ کی قریب سے زیارت کا یہ سب سے پہلا موقع تھا، اس موقع پر حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ اپنے رہائشی مکان (کچے گھر) کے کمرہ میں تشریف فرما تھے اور ان کے چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر سے ایک گھیرا سا بنا ہوا تھا، حجرہ میں جو فرش بچھا ہوا تھا وہ کسی درویش و فقیر ہی کا فرش سمجھا جا سکتا تھا، کسی عام شخص کیلئے اسے کسی عظیم الشان درسگاہ کے شیخ الحدیث اور شیخ طریقت کا فرش سوچنا اور تصور کرنا بھی مشکل ہوتا۔ حضرت شیخ الحدیث اکثر و بیشتر اپنے شاگردوں اور دوسرے مخاطبین کو خطاب کے وقت "پیارے" اور "میرے پیارے" کہہ کر مخاطب کرنے کی عادت رکھتے تھے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب "فلمی کلچر" کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا عشق اور دور و محبت عام اور رواج پذیر نہیں ہوا تھا۔

سنیما کی فلموں اور گھروں کے ٹی وی، وی سی آر وغیرہ نے شریف اور باعزت معاشرہ کو بڑا نقصان پہنچایا ہے، اس معاملہ میں عام طور پر پھیلی ہوئی خاموشی اور زباں بندی کسی طرح قابل درگزر نہیں کہی جا سکتی۔

جامعہ اسلامیہ مظفر پور ضلع اعظم گڑھ کے بین الاقوامی علمی مذاکرہ کے موقع پر "حضرت شیخ الحدیث اور اُن کی فقہی خدمات" کے زیر عنوان تقریباً دس صفحات پر مشتمل احقر کا مقالہ "ذکر زکریا" میں صفحہ ۸۷۱ تا ۸۸۱ پر شائع ہو چکا ہے۔

هنالک دعا زکریا ربه

مکرم ومحترم مولانا عبدالقدوس روؔمی مدفیوضکم

بعد سلام مسنون! آپ کی ردّ مودودیت پر کتاب ''تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش پہنچی، میں تو ردمودودیت کی کتابوں کا بڑا عاشق ہوں، لیکن جب سے یہاں (سہارنپور) آیا ہوں بیمار ہوں لیکن فرط شوق میں کچھ حصہ سنا، بہت جی خوش ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بارآور فرمائے۔

آپ کیلئے دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے اور لوگوں کو اس سے مستفید فرمائے۔ یہ ناکارہ آپ کیلئے یہی دعا کرتا ہے۔ فقط

حضرت شیخ مدظلہٗ بقلم شاہد غفرلہٗ

۱۹/ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ

اُستاذ محترم حضرت علامہ صدیق احمد فاروقی کشمیری نور اللہ مرقدہٗ

مدرسہ مظاہر علوم میں اپنے وقت کے علامہ ابن حاجبؒ اور بجا طور پر امام النحو کے مصداق علامہ صدیق احمد صاحب کشمیریؒ جو معیدی کے مشہور مصرعہ کی ہو بہو اور مجسم تصویر تھے۔ معیدی نے تو اپنا نام لیا ہے مگر بے خبری میں وہ ہمارے اِنہی اُستاد محترم علامہ صدیق کی حلیہ کشی کر گیا ہے۔

تسمع بالمعیدی خیر من تراہ (معیدی کو دیکھنے کے مقابلے میں بہتر یہی ہے کہ اُن کا نام ہی سن لو)

اُستاد محترم فن نحو اور معقولات کے مسلم الثبوت مشہور استاد تھے۔ شرح جامی، سلم العلوم، ملاحسن، قاضی مبارک اور میبذی وغیرہ تقریباً زبانی بے تکلف

پڑھاتے تھے لیکن فقہ وفتاویٰ وغیرہ سے بظاہر نا آشنا ہی نظر آتے تھے۔ اور اسے خود بھی سمجھتے، کبھی کبھی اپنی امامت کے قصے مزے لیکر سناتے تھے۔ مثلاً ایک بار لوگوں نے مجھے امام بنادیا، مغرب کی نماز تھی میں نے سورۃ قل یا ایھا الکافرون پڑھنا شروع کی تو وہ ختم ہونے ہی کو نہ آتی تھی، میں لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد کے چکر کاٹنے لگا، ایک چکر ختم ہوتا تو دوسرا چکر شروع ہوجاتا۔ اسی طرح جب کئی چکر ہوگئے تو میں نے لکم دینکم ولی دین پڑھ کر سوچا کہ اب تو سورۃ ختم ہوگئی ہوگی اور رکوع کردیا۔ اسی طرح کے اور بھی اپنے واقعات لطائف و ظرائف سناتے تھے۔ علامہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے احقر نے شرح جامی، سلم، میبذی اور چند اسباق ملا حسن کے پڑھے ہیں، وہ عام مدرسین میں رائج طریقہ کے خلاف کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں فرماتے تھے۔ ترجمۂ عبارت، تفہیم کا انداز لئے ہوتا جس سے سمجھدار طلبہ مطمئن ہوجاتے تھے۔ احقر ابتدائی کتابیں ہدایۃ النحو تک حضرت استاد مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے پڑھ کر آیا تھا، مولانا کے ایک قدیم اور بے تکلف شاگرد آئے اور انہوں نے پوچھا کہ حضرت! سب سے اچھی عبارت کون پڑھتا ہے؟ فرمایا میں پڑھتا ہوں! انہوں نے کہا کہ حضرات اساتذہ میں نہیں بلکہ طلبہ میں کون اچھی عبارت پڑھتا ہے؟ فرمایا عبدالقدوس الہ آبادی! چنانچہ شرح جامی کے سبق میں جب عبارت پڑھی تو فرمایا ''عبدالقدوس! تم عبارت اچھی پڑھتے ہو'' وکفی بی فخراً

موصوف کے سرپرست حضرت استاذ الاساتذہ مولانا سیّد عبداللطیف صاحبؒ ہی معلوم ہوتے تھے اور وہ بہت ہی مردم شناس تھے۔ اُنہوں نے اُن کی علمی صلاحیت کا انداہ لگالیا تھا۔ احقر کے خصوصی استاذ علامہ اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ بھی اُن کے ہم سبق تھے۔ علامہ حضرت ناظم صاحب اور حضرت صدر المدرسین مولانا کامل پوریؒ کے علاوہ

دوسرے کسی استاد سے قطعاً متاثر و مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

موصوف مظاہر علوم کے علامہ ہوتے ہوئے احاطۂ مطبخ کے ایک حجرہ میں قیام پذیر تھے۔ مطبخ میں رہنے کی وجہ سے اُنہیں اپنے حلیہ کی مطلق کوئی فکر بھی نہیں تھی، وہاں کے ملازمین جس حلیہ میں رہتے تھے اُن کا حلیہ بھی اُن سے کچھ زیادہ نمایاں اور ممتاز نظر نہ آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنی رحمتوں اور کرم فرمائیوں سے نوازیں، اُن کی بے نفسی کی زندگی کو دیکھتے ہوئے امید قوی یہی ہے کہ وہ باغِ جنت میں ایسے مگن ہونگے کہ مظاہر علوم کا مطبخ اُنہیں کبھی بھول کر بھی یاد نہ آتا ہوگا۔

حضرت مولانا زکریا قدوسی گنگوہی علیہ الرحمہ

یہ بزرگوار مظاہر علوم میں متوسطات کے اُستاد اور واعظ و مبلغ تھے، کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ زمانہ قیام الہ آباد میں موصوف کا وعظ وہاں کی جامع مسجد میں سن چکا تھا، واعظ اچھے اور خوش بیان تھے لیکن خوبصورت اور حسین و جمیل نہیں تھے جس کا کچھ احساس شاید خود اُنہیں بھی تھا۔

درسگاہ میں انکی مضحکہ خیز بات پر طلبہ ہنس دیتے یا مسکراتے تو بڑی صفائی سے اپنے خاص سہارنپوری لب و لہجہ میں فرماتے کیوں ہنسے ہے؟ میں نہ تو ایسا خوبصورت ہوں کہ مجھے دیکھ کر ہنسی آوے اور نہ اتنا بدصورت ہوں کہ کوئی ہنسے؟

احقر نے مدرسہ مظاہر علوم میں اپنے رفیق درس مفتی یحییٰ مرحوم کی ریس کرتے ہوئے کنز الدقائق کے بعد ہدایہ اوّلین پڑھی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ مفتی یحییٰ مرحوم و مغفور نے کنز الدقائق کے سال میں خارجاً اپنے والد بزرگوار کے ہم سبق مولانا عبدالشکور صاحب کامل پوری سے رمضان سے شوال تک میں شرح وقایہ کامل پڑھ لی اور اگلے سال درخواست دے دی کہ میں نے شرح وقایہ خارج میں مولانا

موصوف سے پڑھی ہے لہٰذا مجھے ہدایہ اوّلین پڑھنے کی اجازت دے دی جائے اور مولانا موصوف نے اُس کی تصدیق بھی فرمادی، چنانچہ اِس پر حکم ہوا کہ شرح وقایہ کا زبانی امتحان لے لیا جائے وہ امتحان میں کامیاب ہوکر ہدایہ کی جماعت میں شریک ہو گئے، ہدایہ اُس وقت حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کے پاس ہورہی تھی، احقر جب مدرسہ آیا تو ترتیب نصاب کے مطابق میرے لئے شرح وقایہ تجویز ہوئی تو میں نے بھی درخواست دے دی کہ میں نے بھی شرح وقایہ خارج میں پڑھی ہے اور یہ بات خلافِ واقعہ بھی نہیں تھی کہ میں نے بھی اپنے ہم سبق کی ریس میں حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے شرح وقایہ جلد اوّل اور کچھ جلد ثانی کے اہم اسباق پڑھ لئے تھے، چنانچہ میری درخواست پر حکم ہوا کہ مولانا زکریا صاحب قدوسی اِن کا امتحان لے لیں، چنانچہ مولانا موصوف نے میرا امتحان لیکر لکھ دیا کہ یہ بہ آسانی ہدایہ پڑھ سکتے ہیں جس کی وجہ سے چند ہی روز بعد شرح وقایہ سے اُچک پھاند کر میں بھی ہدایہ اوّلین کے سبق میں شریک ہوگیا۔ اس سلسلہ میں میری درخواست پر حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ نے بالکل دیانتداری کے ساتھ صاف اور صحیح بات ہی لکھی تھی کہ اِنہوں نے شرح وقایہ کا ایک معتد بہ حصہ مجھ سے سمجھ کر پڑھا ہے لہٰذا جب میری درخواست شوریٰ تحتانی میں پیش ہوئی تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے یہ فرما کر اختلاف کیا کہ یحییٰ نے تو مکمل شرح وقایہ پڑھی ہے جیسا کہ اُن کے اُستاد نے اُن کی تصدیق کی ہے اور اِنہوں نے صرف معتد بہ حصہ پڑھا ہے لہٰذا یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے۔ ابھی شوریٰ ختم نہیں ہوئی تھی کہ نمازِ عصر کی اذان ہوگئی اور میری درخواست پر کوئی فیصلہ تحریر نہ کیا جاسکا، دوسرے روز نائب مہتمم تعلیمات اور میرے مشفق اُستاذ مولانا عبد المجید صاحب مہیسرویؒ نے حضرت ناظم صاحب سے میری درخواست پر یہ حکم لکھوالیا کہ مولانا زکریا صاحب قدوسیؒ ان کا امتحان لیکر نتیجہ سے مطلع کریں چنانچہ مولانا زکریا

صاحب قدوسیؒ نے میرا امتحان لیکر مجھے ہدایہ پڑھنے کے لائق قرار دے دیا اور میں جماعت ہدایہ میں شریک ہوکر مفتی یحیٰ کا پھر ساتھی بن گیا۔

حضرت موصوف مولانا قدوسی علیہ الرحمہ کو مجھ حقیر سے خصوصی تعلق شفقت تھا جس کی وجہ سے سبق کے علاوہ بھی احقر کی حاضری ہو جاتی تھی، ایسی ہی ایک مرتبہ کی حاضری میں حضرت حکیم الامت اشرف العلماء مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کے دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی سے مستعفی ہو جانے کا اہم تاریخی واقعہ مجھ کو سنایا، یہ واقعہ مولانا موصوف کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ نے مسجد مدرسہ قدیم کے صحن میں سنایا تھا۔ مولانا قدوسیؒ نے فرمایا کہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ دارالعلوم دیوبند کے سرپرستان میں سے آخری سرپرست تھے جو دینی مدارس کو خالص دینی رکھنا چاہتے تھے اور سیاست مروجہ سے اساتذہ اور طلباء کو علیحدہ رہنے اور رکھنے پر بہت زور دیتے تھے لیکن دارالعلوم میں حضرت کا فیصلہ کانگریسیت کی وجہ سے نظر انداز کیا جانے لگا تو حضرت نے دارالعلوم کی سرپرستی سے استعفا دے دیا جسے وہاں شوریٰ میں رکھا گیا۔ ارکان شوریٰ دو گروپ میں تقسیم ہو گئے، ایک گروپ کہتا تھا کہ حضرت کا استعفا منظور نہ کیا جائے اور دوسرا گروپ چاہتا تھا کہ حضرت کا استعفا منظور کر لیا جائے۔ مردم شماری کے وقت دونوں ہی گروپ تعداد میں برابر نکلے اس لئے شوریٰ میں شریک سیاسی شاطر مزاج شرکاء نے مشہور و معروف سیاسی طریقہ کو استعمال کرتے ہوئے یہ کوشش کرنی چاہی کہ قبول استعفا والے گروپ میں کسی طرح ایک رُکن بڑھا لیا جائے یا استعفا نامنظور کرنے والوں میں سے ایک رُکن کم کر دیا جائے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ اُس گروپ میں تھے جو حضرت کو راضی کر کے اُن کی سرپرستی کو دارالعلوم کے لئے خیر کا باعث سمجھتا تھا۔ لوگوں نے مولانا کو توڑنے کا فیصلہ کیا اور سہارنپور کے ایک مشہور تاجر حافظ محمد یوسف صاحب انصاریؒ کو اس کام

کیلئے مقرر کیا کہ وہ کسی طرح حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو استعفا کی منظوری کیلئے راضی کر لیں، چنانچہ وہ نظام الدین دہلی گئے اور مولانا کو منظوری استعفا کیلئے ہموار کرنا چاہا لیکن مولانا کاندھلویؒ اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئے تو حافظ یوسف صاحب نے اُنہیں اپنے بزرگوں کا واسطہ اور وسیلہ دیکر اس کے لئے راضی کرنا چاہا (حافظ صاحب موصوف حضرت مولانا گنگوہیؒ کے حقیقی نواسے تھے) مولانا پھر بھی راضی نہ ہوئے تو اُنہوں نے کہا کہ اچھا پھر آپ خود بھی مستعفی ہو جائیں مگر مولانا اپنی جگہ بالکل اٹل رہے اور فرمایا کہ میں نہ یہ کروں گا نہ وہ، تو اُنہوں نے پھر اپنے بزرگوں کا دوبارہ واسطہ اس طرح دینا چاہا کہ اپنی ٹوپی اُتار کر مولانا کے قدموں میں رکھ دی، چنانچہ مولانا نے بادل ناخواستہ روتے ہوئے استعفا لکھ کر اُنہیں دے دیا۔ اس کے بعد اگلی شوریٰ میں اُنہوں نے پہلے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا استعفاء پیش کر کے اُس کی منظوری کرائی۔ مجلس شوریٰ نے خالی الذہنی سے مولانا کاندھلویؒ کا استعفاء منظور کر لیا۔ اکثریت ختم ہو گئی اس کے بعد حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کا استعفاء ایک ممبر کی وجہ سے قبول کر لیا گیا۔ سچ کہا گیا ہے ؏

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مولانا قدوسی گنگوہ کے معروف قدوسی حنفی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ زمانۂ طالب علمی میں انہی کے پاس حجرہ نمبر ۲۲ دارالطلبہ قدیم میں رہا کرتے تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا موصوف ہی نے مفتی صاحب کو حضرت شیخ الحدیث صاحب سے وابستہ ہونے کی رائے یہ کہہ کر دی تھی کہ مولوی محمود اگر...... بننا چاہو تو حضرت شیخ سے متعلق ہو جاؤ ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔ آگرہ کے زمانۂ قیام میں جب مظاہر علوم حاضری ہوئی تو استاذ محترم مولانا قدوسی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حجرہ میں جانا ہوا، اس وقت میں نے اپنے دل کی ایک بات

مفتی مظفر حسین صاحبؒ سے ظاہر کردی کہ یہ حجرہ ہمارے استاذ حضرت مولانا زکریا قدوسیؒ کی درسگاہ ہے اور میرے خیال میں اہل مدرسہ نے اُنہیں محض مودودیت سے تعلق کی وجہ سے مدرسہ سے علیحدہ نہیں کیا تھا بلکہ علیحدہ کرنے کا اصل سبب اُن کی حق گوئی اور بے باکی رہی ہوگی۔ میرا یہ تجزیہ اور تبصرہ سنکر مفتی صاحبؒ نے بھی نہایت سمجھے ہوئے انداز میں اثبات واتفاق ظاہر کیا۔

حق گوئی و بے باکی ہر آن مجھے کرنا　　اللہ کے شیروں کو آتا ہے کہاں ڈرنا

مولانا اپنی مادرِ علمی سے علیحدگی کو برداشت نہ کرسکے اور مدرسہ سے علیحدہ ہونے کے بعد دنیا ہی سے رخصت ہوگئے، غفر اللہ لہٗ۔

حضرت مولانا سیّد ظریف احمد صاحب پورقاضویؒ

مادرِ علمی مظاہر علوم میں احقر کی تعلیمی مدت مجموعی طور پر تقریباً سات آٹھ سال رہی ہے، پہلے سال میں احقر کے اسباق تین حضرات سے متعلق رہے تھے۔ استاذ محترم حضرت علامہ مولانا اسعد اللہ صاحب، مولانا عبدالشکور صاحب کامل پوری اور مولانا سید ظہور الحسن صاحب کسولوی استاد رہے تھے جن کا تذکرہ گزر چکا ہے، دوسرے سال میں تعلیم کا پہلا گھنٹہ مولانا ظریف احمد صاحب کے پاس تھا جن سے میں نے کافیہ ابن حاجب اور شرح جامی بحث فعل پڑھی تھی۔ حضرت مولانا پر انکے اسم گرامی ظریف کا اثر لطیف انداز میں موجود تھا اور وہ اپنے ہنسی اور چٹکلوں کے انداز ہی میں کبھی کبھی تفہیم عبارت کی کوشش فرماتے تھے جو اگر کامیاب نہ بھی ہوتی تو بالکل بیکار بھی نہیں کہی جاسکتی تھی، طلبہ خوشگوار ماحول میں سبق پڑھ لیتے تھے، احقر نے ان سے منطق کی مشہور و معروف چار کتابیں بھی پڑھی تھیں: تہذیب، شرح تہذیب، قطبی اور میر قطبی۔ اس موقع پر اپنی اس مزاجی کیفیت کا ذکر کردینا بے محل اور بیجا نہ ہوگا کہ احقر

دین واعتقاد کے معاملہ میں تو تقلید محض یا تقلید جامد کا قائل ہے لیکن معقولیت میں خود اپنی ذاتی منطق ہی کے مطابق رہنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں منطق کی آٹھ دس کتابوں کا پڑھنا بھی زیادہ کارگر نہ ہوسکا تھا، اسی وجہ سے جب جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں مدرسی کی نوبت آئی اور مجھے سلم العلوم پڑھانے کو دی گئی تو میں نے سب سے پہلے طلبہ کی منطقی واقفیت کا اندازہ کرنے کیلئے یہ سوال کرلیا کہ بتایئے شکل اول کسے کہتے ہیں؟ طلبہ حیرت سے میری شکل دیکھنے لگے جس سے مجھے ان کی منطق دانی کا بخوبی اندازہ ہوگیا تو میں نے بھی بہت مزہ لیتے ہوئے ان سے کہا کہ ارے بھائی! تم لوگ میرے اتنے آسان سوال کا جواب بھی نہیں دے سکے، جب آدمی رات کو سوجاتا ہے تو صبح اُٹھنے کے بعد آئینہ میں اپنی جو صورت نظر آئے اور جو چہرہ سامنے آئے اور دیکھنے کو ملے وہ شکل اول ہے۔ اس طرح طلبہ کی منطق دانی کا اندازہ کرلینے کے بعد میں مطمئن ہوگیا کہ ایسے منطقی طلبہ کو زواہد ثلاثہ اور حمد اللہ، قاضی مبارک جیسی کتابوں کو بھی میں پڑھا سکتا ہوں۔

اُوپر کا لطیفہ تو محض تفنن طبع کے طور پر تذکرہ میں بے ساختہ انداز میں آگیا۔ حضرت موصوف اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب پُرقاضوی کے ہم وطن اور ہمشیرزادہ بھی تھے، حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے خلیفہ اور ماضی قریب کے مشہور مرشد و شیخ حضرت مولانا ابرار الحق صاحب علیہ الرحمہ بھی ان کے تلامذہ میں تھے، حضرت مولانا کے بڑے صاحبزادے مولانا عتیق احمد صاحبؒ بھائی جی مرحوم کے رفیق درس تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب کسولویؒ بانی کتب خانہ امداد الغرباء

استاد محترم حضرت مولانا ظہور الحسن صاحبؒ کا تعلق الہ آبادی طلبہ سے بہت پرانا تھا، مولانا سعید الدین صاحب الہ آبادیؒ موصوف کے رفقاء درس میں رہ چکے تھے، سرخ وسفید گندمی رنگت کے وجیہ اور کھلے ٹھلے کے آدمی تھے۔

احقر مظاہر علوم تک پہنچنے سے پہلے ہی برادرِ محترم مولانا جامی کی زبانی حضرت شیخ الحدیثؒ کا ذکر کئی بار سن چکا تھا اس لئے غائبانہ صرف اُنہی سے واقفیت تھی۔

الہ آباد، سہارنپور پسنجر سے ہم دونوں بھائی عصر کے وقت الہ آباد سے روانہ ہوئے تھے، والد محترم ہم دونوں بیٹوں کو رخصت کرنے اسٹیشن تشریف لے آئے تھے۔ اللہ انہیں اس محبت وشفقت کی بیش از بیش جزا دے اور انکی قبر کو ہمیشہ منور رکھے جیسے وہ دنیاوی حق کے چراغ رہے ویسے ہی وہ نورِ حق کی روشنی میں محشور ہوں، آمین۔

مظاہر علوم میں ہم صبح کے وقت پہنچے تھے نماز فجر شاید اسٹیشن کے باہر قریبی مسجد میں پڑھی تھی، دارالطلبہ قدیم میں حجرہ نمبر ۱۷ الہ آبادیوں کا حجرہ بنا ہوا تھا، اسی حجرہ میں ہم دونوں بھائی بھی پہنچے جہاں اس وقت موجود طلبہ میں مولوی شفیع اللہ الہ آبادی بھی تھے جو اس سال دورۂ حدیث کے ممتاز طلبہ میں تھے۔ مرکز تبلیغ نظام الدین دہلی کے شیخ الحدیث مولانا اظہار الحسن کاندھلویؒ اُن کے برابر کے ساتھی تھے، دونوں میں صرف انیس بیس کا فرق تھا اور یہ فیصلہ میرے لئے مشکل ہے کہ ان میں سے کون انیس تھا اور کون بیس تھا۔

بات کچھ دوسری طرف چلی گئی، لکھ یہ رہا تھا کہ داخلہ مظاہر علوم کے وقت میں غائبانہ طور پر صرف حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ شیخ الحدیث سے واقف تھا،

حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب کو دیکھا تو اُن کے چلے جانے کے بعد اہل حجرہ سے پوچھ بیٹھا کہ یہی حضرت شیخ الحدیث صاحب تھے؟ تو وہ لوگ میرے اس سوال پر ہنس دیے اور کہنے لگے کہ نہیں یہ تو مولانا ظہور الحسن صاحب تھے۔ داخلہ کے بعد جب اسباق شروع ہوئے تو دوسرے گھنٹے میں صرف کی کتاب زنجانی پڑھنی تھی وہ مولانا موصوف کے پاس ہو رہی تھی اُس کے بعد مراح الارواح پھر فصول اکبری بھی۔ زمانہ تعلیم میں دورہ حدیث کے سال میرا قیام مولانا کے مردانہ مکان میں ہی کچھ عرصہ رہا تھا جو اُن کا کتب خانہ بھی تھا، اس لئے وہیں مجھے کتابوں کی پیکنگ اور ڈاکخانے سے اُن کے ارسال کرنے کی مشق بھی ہوئی، جس سال احقر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں دورہ حدیث شریف میں شریک تھا اُس سال ماہِ شعبان میں حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب غریقِ بحرِ رحمت نے تھانہ بھون کا سفر فرمایا تھا اور واپسی پر مولانا موصوف کے مکان کتب خانہ امداد الغرباء میں قیام کیا تھا۔ اس موقع پر ہم لوگوں کا درسِ بخاری شریف بھی ختم ہو رہا تھا، احقر چونکہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے بعد حضرت مصلح الامت ہی سے وابستہ ہو چکا تھا چنانچہ حضرت مولانا سے عرض کیا کہ آج ہماری بخاری شریف پوری ہو رہی ہے اگر حضرت والا بھی شرکت فرمالیں تو خوشی ہوگی۔ حضرت اپنی خمول پسندی کی بناء پر لوگوں سے زیادہ میل جول کا مزاج ہی نہ رکھتے تھے، اسلئے ذمہ دارانِ مدرسہ میں سے کسی کو شاید خبر بھی نہ تھی کہ حضرت مولانا فتح پوریؒ مولانا ظہور الحسن صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اس لئے اُن حضرات کی طرف سے کوئی دعوت بھی نہ تھی پھر یہ بات بھی تھی کہ اُس وقت تو واقعتاً ختم درسِ بخاری ہی ہوتا تھا، ختم بخاری کے نام پر جشن بخاری بپا ہوتا تھا۔ جس طرح آج کل اُس کی نمائش اور تشہیر تجارتی پیمانے پر ہوتی ہے ع

ہم میکدے سے نکلے کہ دنیا بدل گئی

احقر کی درخواست پر حضرت والا نے پہلے تو بے تأمل شرکت پر آمادگی ظاہر فرمادی مگر دوسرے ہی لمحے میں یہ سوال فرمالیا کہ میں جہاں بیٹھ جاؤں گا وہاں سے اُٹھا کر کہیں نمایاں جگہ پر بیٹھنے کو تو نہ کہا جائے گا؟ احقر نے عرض کیا کہ حضرت یہ کیسے ہو سکے گا وہ حضرات تو آپ کو آپ کی شایانِ شان جگہ پر ضرور ہی بٹھانا چاہیں گے، یہ سن کر حضرت نے انکار فرمادیا کہ پھر تو میں نہ جاؤں گا ع

اب ڈھونڈ اُنہیں چراغِ رُخِ زیبا لیکر!

۱۳۷۰ھ میں مولانا ظہور الحسن صاحبؒ کو حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی تجویز پر حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ نے خانقاہ تھانہ بھون کا منتظم و نگراں مقرر فرمادیا تھا، چنانچہ وہ آخر وقت تک وہیں رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مفتی صاحب کا فقہ و افتاء میں جو مقام تھا وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، وہ ایک طویل عرصہ تک مظاہر علوم میں معین مفتی و مدرس رہے، اُس کے بعد مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مفتی و شیخ الحدیث رہے، اُس کے بعد دار العلوم کے صدر مفتی اور شیخ الحدیث ثانی رہے، آخر عمر میں دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی ہونے کے زمانہ ہی میں مظاہر علوم سہارنپور کے سرپرست مفتی اعظم اعزازی مقرر کیے گئے۔

احقر نے مظاہر علوم میں حضرت موصوف سے فقہ کی مشہور کتاب قدوری اور اُصول فقہ کی کتاب نور الانوار پڑھی تھی۔ حضرت استاذ کے وسعت مطالعہ اور قوت حفظ کا جو اندازہ ہوگیا تھا تو احقر نے اِس سے فائدہ اُٹھانے کی یہ صورت نکال لی تھی کہ تقریباً ہر جمعرات کو اُن سے فرمائش کر بیٹھتا کہ آج سبق کی چھٹی رکھیے اور ہماری معلومات میں اضافہ فرمائیے، چنانچہ موصوف جیسے پہلے ہی سے اسکے لئے تیار رہتے تھے اور کتابی سبق کے بجائے معلوماتی سبق شروع ہو جاتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کی نظر میں وسعت بھی تھی اور قوت حفظ بھی بہت اچھی تھی اس لئے تقریباً ہر علم و فن میں کچھ نہ کچھ درک ضرور رکھتے تھے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

احقر کو ہدایہ پڑھنے کے زمانہ میں تردید مودودیت کیلئے سب سے پہلے حضرت مفتی صاحب ہی نے متوجہ فرمایا تھا، حضرت مفتی صاحب کی خواہش اور آرزو تھی کہ میں دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے طلبائے فارغین کو فرق ضالہ و مضلہ کی تردید و تعاقب کی تحریری تربیت دوں اور ان کے جملہ مصارف کی کفالت وہ کریں گے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

استاذ محترم حافظ محمد یاسین صاحبؒ مریاڈیہی (الہ آبادی)

احقر نے حفظ قرآن مجید ختم کر لینے کے بعد تقریباً سال دو سال حافظ صاحب موصوف کی خدمت میں ان کے گھر پر ایک فردِ خانہ کے طور پر گزارا ہے، احقر کی عمر ۱۰ سال کے قریب تھی اور قد و قامت کے لحاظ سے عمر کا اندازہ اس سے بھی کم ہوتا ہوگا۔ حافظ صاحب ویسے تو بڑے خوش مزاج بھی تھے اور اکثر خوش مزاجی کا اظہار بھی کرتے تھے لیکن استاد ہونے کی حیثیت سے وہ ایسے استاد بھی تھے جنکے قافیہ میں جلاد کا لفظ بالکل بے تکلف استعمال کیا جا سکتا ہے، تعلیم کے سلسلہ میں اور تعلیم بھی حفظ قرآن کی پٹائی تو لازم و ملزوم ہی کی حیثیت رکھتی ہے ویسی پٹائی تو میرے دل نے شاید ہی کبھی یاد کی ہو لیکن حافظ صاحب کا صرف ایک عدد تھپڑ احقر اب تک شاید پوری طرح نہیں بھلا سکا ہے اور یہ تھپڑ پڑھائی سے متعلق نہیں تھا، اس لئے بھی یہ بھلایا نہ جا سکا۔ حافظ صاحب کے اس تھپڑ کا شانِ نزول بھی ملاحظہ فرمالیجے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ ان کا مکان بمرولی ہوائی اڈہ کے قریب ہی تھا۔ ایک رات کو

حافظ صاحب نے آسمان پر کوئی چمکدار چیز دیکھی تو مجھے بھی دکھانا چاہا کہ دیکھو وہ کیا ہے؟ رات کا وقت تھا میں انکی انگلی کا اشارہ اور اس کا صحیح رُخ نہیں دیکھ پا رہا تھا کہ انہوں نے جھنجھلا کر ایک بڑا زوردار تھپڑ رسید کر دیا جس نے میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا تو نہیں کیا بلکہ شاید کچھ روشنی ہی بڑھا دی اور میں نے دیکھ لیا کہ شاید چھٹے یا ساتویں آسمان پر کوئی چھوٹی سی روشنی دکھائی دے رہی ہے، وہ یا تو کسی کا اُڑایا ہوا غبارہ تھا یا بہت بلندی پر اُڑنے والے کسی جہاز کی روشنی تھی، ظاہر ہے کہ اس روشنی کو نہ دیکھ سکنا کسی طرح لائق تعزیر جرم نہیں تھا، اس لئے احقر بھی اگر اسے نہیں بھول سکا ہے تو یہ نہ بھول سکنا بھی بالکل غیر اختیاری ہے جسے لوور کورٹ سے لیکر سپریم کورٹ تک کوئی عدالت قابل تعزیز جرم قرار نہ دے سکے گی۔

احقر کے اساتذۂ گرامی

میری بالکل ابتدائی تعلیم تو والد صاحب کے اندازِ تربیت اور مخدومہ دادی مرحومہ کے ذریعہ سب سے پہلے اپنے گھر پر ہوئی، سب سے پہلے اسماء حسنٰی زبانی یاد کرائے گئے تھے، اُس کے بعد اپنے محلّہ کی مسجد میں ہوئی جہاں سورۂ فجر شروع ہونے پر اُس وقت کی مروّج رسم کے مطابق گھنگنی تقسیم ہوئی تھی۔ اسی زمانہ میں روزۂ کشائی کی رسم بھی کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں والد صاحب کا اصلاحی تعلق حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے قائم نہیں ہوا تھا اور ہمارے دادہال و ننہال میں رسوم رواج کے مطابق جاری تھیں۔ اس وقت میری عمر سات سال رہی ہوگی، ظاہر ہے کہ سات سال کی عمر میں اس وقت کے تمام استادوں کے نام تو شاید مجھے معلوم بھی نہ ہو سکے ہوں، اسی زمانہ میں مولوی لئیق احمد صاحب مہنگاویؒ سے پرائمری اسکول میں بھی کچھ پڑھا تھا، البتہ حفظ شروع کرنے سے پہلے الہ آباد کے مشہور اُستادِ حفظ حافظ

رجب علی صاحب علیہ الرحمہ سے پارۂ عم پڑھنا یاد ہے۔ ان کے بعد حفظ کے استاد حافظ عبدالوحید صاحب مرحوم و مغفور تھے اور ممتحن حضرت قاری محبّ الدین صاحب امام جامع مسجد الہ آباد تھے۔ پونے تین سال کی مدت میں حفظ قرآن مجید پورا ہوا تھا، اُسی سال حفظ کی دستار بندی حضرتِ موصوف کے ہاتھوں جامع مسجد الہ آباد میں ہوئی تھی اور اسی وقت سے عمامہ باندھنے کی مشق و عادت بھی ہوگئی تھی۔ حفظ کے بعد کچھ دنوں مریاڈیہہ میں حافظ محمد یاسین صاحبؒ (محشی بہشتی ثمر و مجاز حضرت مولانا سیّد محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ) کے پاس قرآن مجید کا دور، درجۂ سوم میں اُردو کی تعلیم، حساب کی کچھ مشق کی، تعلیم الدین، بہشتی ثمر سے عقائد و مسائل پڑھے۔ مجاہد کبیر حضرت سیّد احمد شہید کے واقعاتِ جہاد حافظ صاحب موصوف سے ہی پہلے پہل سنے جو دل نشیں ہوگئے۔ ۱۹۳۶ء میں والد صاحب کے تبادلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، سب سے پہلے فتح گڑھ جانا ہوا جہاں قرآن مجید کا دور ہوتا رہا، اسی زمانہ میں الہ آباد کے زمانۂ قیام میں کچھ عرصہ ابتدائی فارسی مولانا محمد ابراہیم صاحب کیرانویؒ سے مدرسہ اشرفیہ میں شروع کی، اُس کے بعد فتح پور میں حضرت مولانا سیّد ظہور الاسلام صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ میں ایک سال کے قریب پڑھا، وہاں مولانا اسحاق صاحب الہ آبادی سے میزان و منشعب اور پنج گنج اور مولانا عبدالوحید صاحب صدیقیؒ سے دروس الادب پڑھی۔ گلستاں بوستاں بھی یہیں پڑھی، والد صاحب سے علم الصیغہ شروع کیا تھا کہ کانپور جانا ہوگیا جہاں جامع العلوم میں داخلہ ہوا وہاں ایک استاد سے (جو قمیص اور چوڑے پینچے کا پائجامہ پہنتے تھے اور کچھ مبتدع قسم کے بھی تھے مروّجہ قرآن خوانی میں میرے شریک نہ ہونے پر ناگواری کا اظہار بھی کرتے تھے) شرح مأۃ عامل اور فصول اکبری پڑھتا ہوا جامع العلوم چھوڑ کر مظاہر علوم چلا گیا جہاں دوبارہ یہی کتابیں امام النحو حضرت علامہ صدیق احمد صاحب کشمیریؒ نے امتحان لیکر

تجویز فرمائیں اور استاذی حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ نے ابتدائی صرف ونحو کی بنیادی کمزوری بھی دور کرادی۔ احقر نے مندرجہ ذیل حضرات اساتذۂ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور جتنا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا اُس کی تحصیل کی۔

کن اساتذۂ کرام سے کیا پڑھا؟

(۱) حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب رامپوریؒ سے نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایت النحو، مفید الطالبین، شافیہ (صرف میں کافیہ کی بہن) شرح وقایہ، رشیدیہ، ہدایہ اوّلین، مسلم شریف، مسلسل بالشعراء۔

(۲) حضرت مولانا ظہور الحسن صاحب کسولویؒ سے فصولِ اکبری، مراح الارواح، زنجانی۔

(۳) حضرت مولانا عبدالمجید صاحب مہیسرویؒ سے نورالایضاح۔

(۴) حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کامل پوریؒ سے کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، مرقاۃ، جلالین شریف۔

(۵) حضرت مولانا ظریف احمد صاحب پُر قاضویؒ سے کافیہ، بحث فعل، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی۔

(۶) حضرت مولانا امیر احمد صاحب کاندھلویؒ سے کنز الدقائق، تعلیم المتعلم، نفحۃ الیمن، مقاماتِ حریری، سبعہ معلقہ، مختصر المعانی۔

(۷) حضرت مولانا اکبر علی صاحب سہارنپوریؒ سے اصول الشاشی، تلخیص المفتاح۔

(۸) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کشمیریؒ سے شرح جامی، سلم العلوم، ہدیہ سعیدیہ، ملاحسن، میبذی۔

(۹) حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ سے مختصر القدوری، نورالانوار۔

(۱۰) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ سے دیوانِ متنبی، دیوانِ حماسہ، عروض المفتاح۔

(۱۱) حضرت مولانا محمد زکریا قدوسی گنگوہیؒ سے ہدایہ ثالث، بیضاوی شریف۔

(۱۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب اجراڑویؒ سے مقدمہ مشکوٰۃ شریف۔

(۱۳) حضرت مولانا منظور احمد خانصاحب سہارنپوریؒ سے سراجی، نسائی شریف، ابن ماجہ، مؤطین شریفین۔

(۱۴) حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے ابوداؤد شریف کامل، بخاری شریف جلد ثانی، مسلسلات المحدثین۔

(۱۵) حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوریؒ سے ترمذی وطحاوی کے علاوہ خصوصی استفادہ۔

(۱۶) استاذ الکل حضرت مولانا سیّد عبداللطیف صاحب پور قاضویؒ سے بخاری شریف جلد اوّل، مسلسلات الفقہاء اور خصوصی استفادہ۔

حضرت قاری محمد سلیمان صاحب دیو بندیؒ سے روایت حفص کی تکمیل اور قرأت کی مشق۔

حضرت مولانا جمیل الرحمٰن صاحب امروہویؒ (نگرانِ تقریر)

دارالعلوم دیوبند میں

۱۳۶۳ھ

(۱) حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ نے امتحانِ داخلہ لیا۔

(۲) حضرت مولانا عبد السمیع صاحب دیوبندیؒ سے مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، سلم العلوم پڑھی۔

(۳) حضرت مولانا عبدالخالق صاحب ملتانیؒ سے مطول پڑھی۔

(۴) حضرت مولانا محمد جلیل صاحب کیرانویؒ سے میبذی پڑھی۔

....

والد محترم حضرت مولانا محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری علیہ الرحمہ سے فراغت کے بعد قصائد عرفی، غزلیات نظیری، سہ نثر ظہوری اور نہج البلاغہ وغیرہ پڑھی۔ اب شاید ان کتابوں کا کوئی پڑھنے پڑھانے والا بھی مشکل ہی سے ملے گا۔

بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے ان سب اساتذۂ کرامؒ کی برکت اور انکے فیض سے سہارنپور، الہ آباد، مرادآباد، لکھنؤ، ڈابھیل، ڈھاکہ، کدورہ، اٹاوہ، آگرہ، وغیرہ میں دینی مدارس، اسکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ نے بھی دینی اور علمی استفادہ کیا جنکی تعداد کافی ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی طالب علمی

مدرسہ مظاہر علوم سے الہ آبادی طلبہ کا کافی پرانا تعلق ہے۔ احقر ۱۳۵۷ھ میں جب مظاہر علوم یا اور دار الطلبہ قدیم کے حجرہ نمبر ۱۷ میں قیام کا نظم ہوا تو حجرہ کے دروازہ پر خوش خط تحریر میں جن الہ آبادی طلبہ کے نام ایک کاغذ پر چسپاں تھے ان ناموں میں سب سے پہلا نام قاری عبید اللہ الہ آبادی کا تھا جو الہ آباد کے ایک

مشہور قصبہ نارہ کے رہنے والے تھے، اُردو کے ایک مشہور شاعر جو داغ دہلوی کے خاص شاگرد تھے نوح ناروی وہ اسی قصبہ کے رہنے والے تھے، ہم لوگ حسن منزل الہ آباد کے جس مکان میں رہتے تھے اس کے بہت سے پڑوسی بھی نارہ کے رہنے والے تھے۔ قاری عبید اللہ صاحب کچھ سیاسی مزاج اور کھدر پوش بھی تھے، اس لئے اہل مظاہر انہیں برداشت نہ کر سکے تو دارالعلوم دیوبند چلے گئے، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد الہ آباد گھنٹہ گھر کے بازار میں شبراتی کی مسجد کے نام سے جو مسجد ہے وہاں امامت کرتے رہے اور مدرسہ مصباح العلوم اور اخیر میں بیت المعارف میں پڑھاتے بھی رہے، احقر سے بہت محبت فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ آمین

حافظ شفیع اللہ صاحب کا قیام بھی حجرہ نمبر ۱۷ میں تھا، حجرہ میں مقیم طلبہ میں وہی اس وقت سب سے بڑے اور تعلیم میں بھی بڑھے تھے جس سال احقر داخل ہوا ہے وہ ان کا دورۂ حدیث کا سال تھا، وہ بخاری شریف اور ترمذی شریف کی تقریریں لکھنے کیلئے مجلد موٹی موٹی کاپیاں رکھتے تھے جس کے حوض میں ایک کتاب کی تقریر اور حاشیہ پر دوسری کتاب کی تقریر لکھتے تھے۔ تقریروں کا یہ بڑا اچھا مجموعہ ان کے پاس تیار ہو گیا تھا مگر بعد میں جب وہ محلہ چک الہ آباد کی مسجد میں امامت کر رہے تھے وہ کاپیاں اس مسجد کے حجرہ میں تھیں کہ شہر میں بہت زبردست ہندو مسلم فساد ہو گیا، یہ فساد جمعۃ الوداع کو ہوا تھا، فسادیوں نے اس مسجد کو بھی آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے ان کی وہ کاپیاں بھی آگ کی نذر ہو گئیں۔ مولانا شفیع اللہ صاحب نے ذریعۂ معاش کے چکر میں طبیہ کالج الہ آباد میں طب پڑھ کر نمایاں کامیابی حاصل کر لی اور اسی کالج میں استاد بھی مقرر ہو گئے، شاید انہوں نے علم دین کی خدمت کے ذریعہ لوگوں کے روحانی علاج کی بہ نسبت جسمانی علاج کو زیادہ بہتر سمجھا یا معاشی و دنیاوی

فائدہ ان کو اسی میں زیادہ نظر آیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

حضرت الاستاذ مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کو ان کے طب پڑھنے کی خبر سے رنج ہوا تھا کہ ایک اچھا عالم دین ضائع ہو گیا مگر جف القلم بما ھو کائن کی صورت ہے۔

قاری حبیب احمد صاحبؒ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے پڑھ کر مظاہر علوم سہارنپور آئے تھے، امام جامع مسجد الہ آباد قاری محب الدین احمد الہ آبادیؒ کے خاص شاگرد تھے، پڑھنے کے زمانہ میں محلہ بنجاران کی اندرونِ محلہ مسجد میں امام رہے، ان کے والد صاحب محلہ کٹرہ شہر الہ آباد میں مسجد میناشاہ کے امام تھے۔ دورانِ تعلیم ہی ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا، مسجد والوں نے تعلیم ختم ہونے پر انہی کو امام بنالیا، احقر نے بھی ایک زمانہ میں اس مسجد میں بعض اوقات نماز پڑھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے والد صاحب رحمہ اللہ کو کئی بار حج وزیارت سے مشرف فرمایا تھا، جب وہ حج پر جاتے تو اپنی جگہ پر مجھے کام کرنے کی صورت وسہولت نکال دیتے تھے۔ آخر میں ایک بار جب احقر کو مدرسہ عالیہ امدادیہ مراد آباد میں جگہ مل گئی تو قاری صاحب موصوف نے بھی والد صاحب کی قائم مقامی گورنمنٹ کالج الہ آباد میں کی تھی۔

محلہ بنجاران کی امامت کے زمانہ میں ہم لوگ اکثر جمعرات کی شام کو قاری صاحب کی مسجد میں پہنچ جاتے اور وہیں کچھ پکنک کی صورت ہو جاتی تھی۔ محلہ بنجاران میں ایک مرتبہ رات کو بعد نمازِ عشاء حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کا وعظ بھی ہوا تھا جو شاید دس بجے ہی تک ہوا تھا اور استادِ محترم نے یہ کہہ کر وعظ ختم فرما دیا تھا کہ اگر دیر تک جلسۂ وعظ چلنے کی وجہ سے نمازِ فجر قضا ہو جائے تو ایسا جلسہ قابل ترک ہے، جماعت سے نماز پڑھنا اہم واقدم ہے، وعظ سننا تو مستحب ہی ہے اس کی وجہ سے نماز یا جماعت متاثر نہ ہونی چاہئے۔ مظاہر علوم میں میرے خاص رفقاء درس یہ تھے: مفتی

سیّد محمد یحییٰ سہارنپوریؒ، مفتی محمد وجیہ ٹانڈویؒ، مفتی عاشق الٰہی بلند شہریؒ، مولانا سیّد صدیق احمد باندویؒ، مولانا محمد ابراہیم آنند (گجرات)۔

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی

احقر نے مشکوٰۃ شریف ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھی تھی، اس وقت احقر کے اسباق تو دو تین ہی حضرات اساتذہ سے متعلق تھے جن میں سے ایک استاذ محترم حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب کشتہ دیوبندیؒ تھے جن سے احقر نے سلم العلوم، مشکوٰۃ شریف اور نخبۃ الفکر پڑھی تھی اس لئے یہ بات بے تکلف لکھی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم کو میری آئندہ زندگی کیلئے زینۂ ترقی اور راہ کی روشنی کہنے میں ہرگز کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ دارالعلوم میں حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب علیہ الرحمہ کے علاوہ حضرات کا ذکر بھی یادوں کے اس چراغ میں آجانا چاہئے ان کے ذکر سے چراغ کی روشنی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ (شیخ الادب والفقہ دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا محمد جلیل صاحب کیرانویؒ اور حضرت مولانا عبدالخالق صاحب ملتانیؒ۔ اوّل الذکر سے احقر نے اگرچہ کوئی سبق تو نہیں پڑھا لیکن دارالعلوم میں احقر کا امتحانِ داخلہ موصوف ہی نے لیا تھا اور شرح جامی بحث فعل سے ایک غیر متعارف اور غیر متوقع مقام کی عبارت پڑھوائی تھی، داخلہ کے امتحان کے بعد مجھے مطلوبہ کتاب مشکوٰۃ شریف تو دے دی لیکن خدا جانے کیوں مجھ جیسے غیر معقولی شاعر مزاج طالب علم کیلئے سلم العلوم اور میبذی کی پخ بھی ضروری سمجھی ورنہ یہ دو گھنٹے کسی دوسرے علم وفن کی کتاب پڑھ کر کام ہی آجاتے۔

فن منطق کی معقولیت کا اندازہ اس مثال سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی

منطقی دیوار پر بنی ہوئی شیر کی تصویر کو دیکھ کر اسی کو درندہ اور چیر پھاڑ کرنے والا جانور ثابت کرسکتا ہے، وہ تصویر دیکھ کر کہے گا، یہ شیر چیر پھاڑ کرنے والا ہے اور طریقۂ استدلال یہ ہوگا کہ ھذا اسد (یہ شیر ہے) اور کہے گا کل اسد مفترس (ہر شیر درندہ ہوتا ہے) فلھذا ایضا مفترس (لہٰذا یہ شیر بھی چیر پھاڑ کرنے والا درندہ ہے)

دارالعلوم کے دوسرے چراغ جن کی یاد کا چراغ مجھے روشنی دے رہا ہے وہ مولانا عبدالخالق صاحب ملتانیؒ تھے جو دارالعلوم کی ۱۹۴۲ء والی اسٹرائیک کے بعد آنے والے اساتذہ میں سے ایک تھے۔ احقر نے موصوف سے مطول پڑھی تھی جو صرف میرے زمانۂ تعلیم کو بے ضرورت طول دینے کیلئے تجویز ہوگئی تھی۔

مولانا عبدالخالق صاحب پنجابی تھے، عربی مدارس میں ایسے پنجابی حضرات اساتذہ کے اُردو زبان سے متعلق متعدد لطیفے اور چٹکلے زباں زد ہیں، ایک چٹکلہ یہاں بھی پڑھ لیجئے۔

موصوف نے مطول کا تعلیمی سال ختم ہونے پر آخری دن طلبا کو رخصت فرماتے ہوئے انہیں مختصر طور پر کچھ ''کلمات تودیع'' ارشاد فرمائے تھے، اس وداعی تقریر میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ''آپ لوگوں نے جو کچھ دارالعلوم میں سیکھا اور پڑھا ہے اپنی آئندہ زندگی میں اسے عملی پاجامہ پہنایئے''۔ اگر کوئی خوش مزاج شاگرد پوچھ بیٹھتا کہ حضرت! کرتے کے بغیر صرف پاجامہ پہننا اچھا نہیں لگتا، اس سے بہتر تو تہمد اور لنگی ہوتی ہے تو شاید درسگاہ قہقہہ زار زعفران کا کھیت بن جاتی۔

دارالعلوم دیوبند ہی کے ایک قدیم پنجابی استاد کا لطیفہ زمانۂ طالب علمی میں سنا تھا کہ انہوں نے کچھ دنوں دارالعلوم میں گزارنے کے بعد فرمایا کہ اُردو زبان کوئی علمی زبان نہیں ہے اس میں تو عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ صرف ہاں اور نہیں اُردو کا

پیوند لگا دیا جاتا ہے تو ان کے کسی معاصر اُردو داں استاد نے ان سے پوچھا کہ اچھا بتایئے کہ چھبیلی، رنگیلی، رسیلی کا مطلب کیا ہے، انہوں نے تڑ سے فارسی میں جواب دیا ''شش گربہ ہائے رنگیں رسن را گرفت'' (چھ بلیوں نے رنگین رسّی کو پکڑ لیا)

تیسرے استاد حضرت مولانا محمد جلیل صاحب کیرانویؒ جن سے احقر نے میبذی پڑھی تھی جو مظاہر علوم میں بھی پڑھ کر آیا تھا شاید یہ احقر کیلئے قدرت کی طرف سے کوئی سزا ہی تھی کہ احقر کو میبذی اور سلم جیسی کتابیں دو دو مرتبہ پڑھنی پڑیں۔ میبذی پڑھنے کے زمانہ میں احقر نے استاد محترم سے ایک دن یہ سوال کیا تھا کہ موسم سرما میں لوگوں کے منہ سے بھاپ کیوں نکلتی ہے؟ مولانا نے اس کا جو جواب دیا تھا احقر کو اس سے اطمینان تو نہیں ہوا تھا جس کی ممکن وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس سوال کا صحیح محل فلسفہ کی درسگاہ کے بجائے طب کی درسگاہ ہوگی۔ نوز الله مراقدهم و برد الله مضاجعهم آمين

مولانا ارشاد احمد فیض آبادیؒ

احقر جب دارالعلوم میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہا تھا تو موصوف بھی میرے ہم جماعت تھے، اللہ تعالیٰ ارشاد و تبلیغ ہی کیلئے شاید پیدا فرمایا تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی اُنہیں خاموش کم ہی دیکھا گیا تھا۔ کسی چیز کے نتیجہ میں وہ بیچارے ایک بار لغت دیکھنے میں غلطی کر گئے، قصہ یہ ہوا کہ احقر نے مظاہر علوم میں اُستاذ محقق علامہ اسعد اللہ صاحب سے سن لیا تھا کہ عشاء کے بعد وتر پڑھی جاتی ہے عام طور پر لوگ اُسے بالکسر ہی بولتے ہیں لیکن اُستاذ محترم نے بتایا کہ قرآن مجید کی سورۂ فجر میں یہ لفظ والشفع والوتر آیا ہے یہ بالفتح استعمال ہوا ہے فصیح تلفظ وتر ہی ہے میں نے یہ بات اپنے بعض دوسرے ساتھیوں کو بتادی۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف کی کتاب الصلوٰۃ میں جب ''باب الوَتر'' آیا تو اُن ساتھی نے باب الوَتر پڑھ دیا، مولانا ارشاد نے اُنہیں ٹوکا تو اُنہوں نے میرے حوالہ سے یہ بات کہہ دی کہ بالفتح فصیح ہے۔

مولانا ارشاد صاحب نے فوراً عربی لغت دیکھی تو اُنہیں ایک لفظ وتر بفتحتین نظر آیا، اُنہوں نے اُسکے معنی پر توجہ نہیں کی اور کہہ دیا کہ عبدالقدوس نے غلط اصلاح کی ہے، وہ لفظ بفتحتین ہے اور وہ لغت لیکر میرے پاس آنے کیلئے تیار ہو گئے۔ کچھ ساتھیوں نے آکر مجھ سے بتایا کہ وہ تمہاری غلطی بتانے کیلئے تمہارے پاس آرہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ بفتحتین ہے، میں نے کہا کہ اُن سے کہہ دیں کہ اُس لفظ کے معنی تو دیکھ لیں، وتر بفتحتین کمان کی تانت کو کہتے ہیں اور وتر طاق عدد کیلئے بولا جاتا ہے۔ ایک، تین، پانچ، سات اور نو کو وتر اور دو، چار، چھ، آٹھ کو شفع (جفت) کہیں گے۔

یہ بات سنکر ان کو اپنی غلط بھاگ دوڑ روک دینی پڑی، کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں　　　وہ طفل کیا گریگا جو گھٹنوں کے بل چلے

مقصد یہ ہے کہ مولانا ارشاد احمد فیض آبادی بہر حال وعظ و بیان کے میدان کے اچھے شہ سوار تھے اور میرے مخلص اور قدر شناس دوست تھے۔ میری سب سے پہلی تصنیف اور مجھ سے مشہور کتاب ''دیوبند سے بریلی تک''، قلمی بیاض میں عرصہ تک پڑی رہ گئی تھی، اُنہوں نے اُسے دیکھا تو دار العلوم کے مہتمم حضرت حکیم الاسلام فخر الاماثل قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ سے اُس کا ذکر کر کے برادرِ محترم مولانا محمد سالم صاحب کے ادارہ تاج المعارف سے پہلی بار اُس کی اشاعت کرا دی جس پر حضرت حکیم الاسلام کا یادگار گرامی نامہ اور مولانا محمد سالم صاحب کا پیش لفظ جو

''آں سوئے خوں'' کے عنوان سے لکھا گیا شامل کتاب ہے۔

احقر نے ۱۳۹۰ھ میں آگرہ آنے کے کچھ زمانہ کے بعد آگرہ کے ایک مخلص اور دیندار مہربان حاجی تصور حسین عرف حاجی تصو مرحوم کے ساتھ اُن کی نئی خریدی ہوئی کار کے افتتاح کے طور پر سہارنپور دیوبند کے اطراف و مضافات کاندھلہ، جھنجھانہ، تھانہ بھون، جلال آباد، نانوتہ، لوہاری اور گنگوہ وغیرہ کا سفر کیا تھا۔

اِس سفر میں میرے قدیم کرم فرما حاجی عبدالمالک صاحب اور ماسٹر محمد علی صاحب سابق پرنسپل شعیب محمدیہ انٹر کالج، آگرہ بھی رفیق سفر رہے تھے، دیوبند پہنچ کر ہم لوگ اِس طرح تین جگہ ٹھہرے تھے۔

احقر کے ساتھ ماسٹر صاحب تو دار العلوم کے مہمان خانہ میں ٹھہرے، حاجی تصور حسین صاحب مولانا اسعد مدنی ؒ کے مہمان ہوئے، حاجی عبدالمالک صاحب حضرت مہتمم قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مہمان رہے تھے۔ اِس موقع پر مولانا ارشاد احمد صاحب نے مجھے اپنے گھر پر بلا کر حق ضیافت ادا کیا تھا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ ورحمہم اللہ

مولانا خالد سیف اللہ گنگوہی قاسمی

دار العلوم دیوبند میں مشکوٰۃ شریف کے سبق میں میرے رفیق درس طباع و ذہین ساتھی تھے، چائے نوشی کے بڑے شوقین تھے، بڑی نفاست سے عمدہ چائے بناتے اور پیتے پلاتے تھے۔ احقر نے صحیح معنی میں چائے نوشی اُنہیں سے سیکھی تھی۔ اُن ہی کے ایک اور ساتھی مولوی مسعود عالم بجنوری تھے، یہ بھی چائے کے اچھے نباض اور شوقین تھے۔ دار العلوم کے زمانۂ قیام میں صبح کی چائے اور ناشتہ اُن کے حجرہ میں اُنہی کے ساتھ ہوتا تھا۔

اِس طرح سے ہم اُن چند ساتھیوں کا ایک گروپ بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ خالد سیف اللہ گنگوہیؒ، مسعود عالم بجنوریؒ، فرید الوحیدیؒ، مولانا اسعد مدنیؒ، مولانا سلیم اللہ خان، مولانا رفیق احمدؒ۔ ۱۳۹۰ھ۔ ۱۹۷۰ء میں آگرہ آنے کے بعد جو سفر ہوا تھا اُس میں دار العلوم کے دفتر اہتمام میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب نائب مہتمم سے ملاقات کیلئے حاضر ہوا اور بتایا کہ میں پہلے یہاں کا طالب علم رہ چکا ہوں، تو فرمایا کہ اچھا ہاں! ایک زمانہ ہوا یہاں چند طالب علموں کا ایک گروپ تھا اُس میں آپ بھی تھے مجھے خوب یاد ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

قاری محمد میاں کی یاد

مدرسۂ دیوبند میں ہمارے ساتھی ایک — قاری صاحب بھی تھے بہت ہی نیک
مسجد مدرسہ کے امام تھے وہ — سارے حلقے میں نیک نام تھے وہ
تھے محمد میاں کے نام سے مشہور — حسن سیرت سے دل بھی تھا معمور
اک عزیز قریب ہیں ان کے — نام ان کا جوادِ حق بھی ہے
دہرہ دوں میں قیام ہے ان کا — کارِ حاتم بھی ان سے ہے زندہ
ہو گیا جب انہیں عبید سے معلوم — میرے ساتھی تھے قاریٔ مخدوم
دہرہ دوں کی انہوں نے دعوت دی — اور بلاکر بنائے دوستی رکھ دی
دوستی کی بنا پڑ گئی تو خود سمجھیں — دوستی کر کے دور کیسے رہیں

ہمارے چہار درویش

(۱) حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی علیہ الرحمہ

مفتی صاحب سے احقر کا تعارف اس وقت ہوا تھا جب احقر کا ایک چونکا دینے والا مضمون ''دار العلوم دیوبند کا حال ماضی کے آئینہ میں'' شائع ہوا تھا جس میں دار العلوم کے سابق مظلوم مہتمم کی منصبِ اہتمام سے علیحدگی کی دردناک کہانی پر پڑے ہوئے پردہ کو اُٹھانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی صاف صاف لکھ دی تھی کہ اگر حضرت مہتمم صاحب نے صدر مہتمم بنائے جانے والے جال کو سمجھ لیا ہوتا اور اس وقت کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کی علیحدگی سے ہوا کا رُخ کچھ پہچان لیا ہوتا تو آنموصوف کی بھاری بھر کم شخصیت ان کے حق میں سد سکندری ہی بنی رہتی لیکن مقدر یہی تھا کہ چند سیاسی بازی گروں نے بڑی ہوشیاری و چابک دستی سے یہ ڈرامہ اسٹیج کر دیا اور چند سیاست زدہ ارکان شوریٰ کی ملی بھگت سے یہ تماشہ رونما ہو ہی گیا، نقیب حریت ملک جناب محمد علی جوہر صاحب نے جیل سے اپنی رہائی پر جو شعر پڑھا تھا اُسے اس جگہ نقل کر دینا یقیناً برمحل ہی ہوگا۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور — ہم میکدے سے نکلے کہ دنیا بدل گئی

کچھ لوگوں نے دار العلوم دیوبند کی تبدیلی حالات کو دار العلوم کے صد سالہ اجلاس کی صدر نشین شخصیت سے بھی جوڑا ہے کہ اسے اسی کافرہ کی نظر لگ گئی، دار العلوم کے اجلاس میں آکر اس نے پرجوش حاضرین ملک و ملت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھا تو اس کے دل میں آتش کفر و حسد بھڑک اُٹھی اور پھر اس نے سیاسی ہتھکنڈوں سے کام لیکر اس کے دو ٹکڑے کرا ہی دئے اور پھر مدرسہ مظاہر علوم

سہارنپور جسے دار العلوم دیوبند کا توأم ہی کہا جاتا ہے اس کے ارباب حل وعقد نے بھی اس معاملہ میں وہی راہ اختیار کر لی، دردمند فکر واحساس رکھنے والی ملت اسلامیہ ہند شاید اسے بھول نہ سکے گی، دوسرے حضرات معاملہ کو جس طرح دیکھیں اور سمجھیں لیکن احقر تو یہی سمجھتا ہے کہ ہمارے یہ دونوں ہی قدیم واصل دار العلوم ومظاہر علوم مرحوم ہو چکے ہیں اب اُنہیں محض آکسیجن پر زندہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

صاف گوئی کو مری اہل حرم معاف کریں   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(۲) دوسرے درویش صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جناب سعید احمد صاحب اکبر آبادی مرحوم ہیں

جن کا خمیر بھی شاید وہیں کی مٹی سے بنا تھا مگر مفتی صاحب کے ساتھ رفیق ندوۃ المصنفین کیا ہوئے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے راسخ الفکر مرشدین کے لگائے ہوئے چمن دار العلوم دیوبند کے مالیوں میں مل گئے۔ احقر کے زیر نظر تذکرہ کا اصل موضوع تو یہی ہے کہ احقر کو ملک کے جن مشاہیر کو دیکھنے یا انکے ساتھ رہنے کا کچھ موقع ملا ان کا تذکرہ اس میں آجائے۔ احقر جو خود بھی درویشی و بزرگی سے خدا جانے کس قدر دور ہے وہ دوسرے بزرگوں کی شناخت تو کر ہی نہیں سکتا کہ   ''ولی را ولی می شناسد''!

+ سعید احمد صاحب سے احقر کو تعارف ان کے ایک مضمون سے ہوا تھا جو برہان میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے حضرت حکیم الامت اشرف العلماء پر لکھی گئی حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی ایک مشہور تصنیف ''جامع المجدد دین'' پر نہایت جارحانہ انداز میں تبصرہ کیا تھا، شاید ان کے اسی تبصرہ نے احقر کو بھی قلم ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ احقر کی وہ تحریر اہل علم وفہم کو پسند آئی اور احقر کے ایک

ندیم کرم فرما، جواں مرگ، اسحاق جلیس ندوی مرحوم نے اسے دیکھ کر احقر سے کہا کہ ''آپ کو جب لکھنا آتا ہے کہ تو آپ اس صلاحیت سے کام کیوں نہیں لیتے؟ آپ لکھتے رہیں۔'' موصوف اگرچہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن میدان صحافت میں وہ پہلے سے آئے ہوئے تھے، وہ ندوی تھے احقر مظاہری تھا، جہاں سے کسی ابوالقلم کا نکلنا کچھ زیادہ قابل توقع نہیں تھا، اسی وجہ سے میری تحریروں کے اکثر پڑھنے والے مجھے قاسمی ہی سمجھتے تھے بلکہ بعض لوگوں نے تو میرے نام کے ساتھ فاضل دار العلوم دیوبند لکھ بھی دیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ کوئی چیز کسی کی میراث نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہی اصل خالق ہے وہ جسے جو چاہے بنا دے۔ اسی موقع پر ایک دوسری بات کا لکھ دینا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کے بہت سے اصحاب نگارِش کسی مضمون نگار کے مضمون اور تحریر کیلئے تخلیق کا لفظ لکھنے میں کچھ بے احتیاطی کر جاتے ہیں، احقر تخلیق کی صفت کو صرف خالق حقیقی کی ہی ذات تک محدود رکھنے ہی کو صحیح سمجھتا ہے، انسانوں کیلئے تخلیق کا لفظ استعمال نہ ہونا چاہئے، ہمارے اساتذۂ کرام اور دیندار اہل علم وفکر کا یہی خیال تھا۔ اپنی اس تحریر میں جو ممکن ہے احقر کی آخری تحریر ہو۔ برادرم جواں مرگ اسحاق جلیس ندوی مرحوم ومغفور کی اس قدر شناسی کو احقر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ انہوں نے میری اس تحریر کو دیکھ کر حوصلہ افزائی کر کے مجھے مستقل طور پر مروج زبان میں قلم کار اور قدیم زبان میں صاحب قلم بنا دیا۔ احقر کو گھر کے بچے تو صرف ''صاحب'' ہی کہتے ہیں لیکن دوسرے لوگ ''صاحب قلم'' بھی کہتے ہیں۔ اس مختصر خودنوشت آپ بیتی میں علیحدہ علیحدہ متعدد حضرات پر مستقل طور پر لکھنے میں یہ تذکرہ مختصر کے بجائے مطول ہو جائے گا، اس لئے قلم کی لگام کستے ہوئے ایک ہی تذکرہ میں دو دو حضرات کا ایک ساتھ ذکر کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۳) حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھیؒ

کا ذکر خیر بھی احقر کے ذمہ بطور قرض واجب ہے کہ احقر کو گمنامی کی دنیا سے نکالنے میں موصوف کی خردنوازی اور حوصلہ افزائی کا بھی کافی دخل رہا ہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کا پچاسی سالہ جشن ''المہر جان التعلیمی'' جس زمانہ میں منعقد ہوا تھا تو اس وقت تک احقر صرف شہر آگرہ ہی کے حدود میں متعارف تھا، ندوہ کے اجلاس میں مدعوین کو ناموں کے بیج دئے گئے تھے، اپنے بیج میں احقر نے صرف اپنا نام ''عبدالقدوس رومی'' لکھا تھا۔ موصوف نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر ''مفتی شہر آگرہ'' بھی لکھوایئے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ منصب عطا کیا ہے تو اسے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ کہا کرتے کہ آپ مودودی صاحب کے لٹریچر پر اچھی طرح لکھ دیجئے اور اس موضوع کو اپنا لیجئے، ان شاء اللہ مفید اور یادگار کام ہو جائے گا۔ جب تک موصوف حیات رہے احقر کے ایک اچھے ہمدرد، مخلص و مشفق ہی کے طور پر رہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ سے احقر کا تعارف پہلے ہی ہو چکا تھا اور ان سے بھی پہلے

(۴) حضرت مولانا محمد میاں صاحب دہلویؒ

سے تعارف ہو چکا تھا اور احقر کے والد صاحب نے اپنی ایک معرکۃ الآراء کتاب ''سیدنا علی زین العابدینؒ'' احقر کے ذریعہ موصوف کو بھیجی تھی تو مولانا محمد میاں صاحب نے مفتی صاحبؒ اور قاضی صاحبؒ سے احقر کا تعارف اسی کتاب کے حوالہ سے کرایا تھا کہ یہ مصنف سیرت سیدنا زین العابدینؒ کے مصنف کے صاحبزادہ ہیں' اس عنوان سے تعارف کا مطلب شاید یہی ہوگا کہ یہ بھی الولد سر لابیہ (باپ کی طرح بیٹا بھی ہوتا ہے) کے تحت ویسا ہی بے لاگ اور بے باک قلم رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا نعمانیؒ

حضرت مولانا علی میاںؒ

اول الذکر حضرت مولانا نعمانی علیہ الرحمہ سے اپنے تعارف و تعلق کی تفصیلات پر مشتمل ایک مضمون ''الفرقان'' کی خصوصی اشاعت میں لکھ چکا ہوں. جس میں احقر نے اپنی خصوصیت مزاج سے دستبردار نہ ہو سکنے کی وجہ سے بعض تلخ حقیقتیں بھی سپرد قلم کر دی تھیں جسے رسالہ کے ذمہ داروں نے اپنے اختلافی یا تشریحی نوٹ کے ساتھ شائع کر کے اپنے فرض کے ساتھ احقر سے تعلق کا بھی حق ادا کر دیا تھا لیکن بجا طور پر مفکر ملت اسلام مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کے .... نے احقر کی کدوکاوش اور تحقیق و تفتیش سے لکھی ہوئی تحریر کو نہ صرف یہ کہ قابل اشاعت نہیں سمجھا بلکہ اُسے مضمون نگار کو واپس کرنے کی اخلاقی ذمہ داری کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا جس سے وسعت نظر کے مدعیان کی تنگ نظری و کم حوصلگی پر ایسی روشنی پڑتی ہے جسے برسات کی گھٹاٹوپ اندھیری رات میں بھی روزِ روشن کی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔

احقر یہ خیال کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ شاید ان حضرات نے خوش فہمی کی جنت میں رہنے کی وجہ سے یہ خیال کیا ہوگا کہ راقم سطور خوشامدیوں کی طرح کوئی ''قصیدۂ مدحیہ'' لکھ کر پیش کر دیگا مگر میرا وہ مضمون ان کے گمان کے خلاف قصیدۂ مدحیہ ثابت نہ ہو سکا تو انہوں نے اس کی اشاعت ندوہ سے مناسب نہیں سمجھی، یہاں تک تو انکی بات ٹھیک تھی، انہیں اس کا پورا پورا حق حاصل تھا لیکن مضمون کو سرے سے ضبط ہی کر لینا بلکہ ہضم کر جانا تا کہ وہ کہیں دوسری جگہ بھی شائع نہ ہو سکے تو یہ بات ایسے بلند و بالا ادارے کی ادارت کے باعزت مقام سے گری ہوئی ہی کہی جانے کے لائق ہے۔

عم محترم حضرت سیّد عبدالرب صوفی صاحبؒ سے مولانا نعمانی اور مولانا

علی میاں صاحبین کا بہت قریبی، گہرا اور عقیدتمندانہ تعلق بھی تھا جس کی وجہ سے ان حضرات کے ساتھ وہ ایک بار رائے پور کی خانقاہ بھی حاضر ہوئے تھے جس کی اطلاع اپنے مصلح حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب غریق بحر رحمت کو بھی ہوگئی تھی، احقر چونکہ حضرت مصلح الامت کا قدیم خادم تھا اس لئے حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ صوفی صاحب سے کہہ دو کہ وہ کہیں بھی جائیں مگر مطمئن میرے ہی پاس ہوں گے۔ صوفی صاحب سے ملاقات ہونے پر حضرت کا یہ ارشاد انہیں سنایا تو صوفی صاحب بہت زور سے ہنسے اور فرمایا کہ ہاں! بھئی وہی ہوا کہ میں گھوم پھر کر اور کچھ باتوں کی وجہ سے دل برداشتہ ہوکر حضرت ہی کے پاس واپس آگیا۔ رائے پور میں شاہ صاحبؒ کے ساتھ تفریح کیلئے صحرانوردی کے دوران صوفی صاحب نے شاہ صاحب سے بسلسلۂ سلوک کوئی سوال کیا تو شاہ صاحب نے اس وقت تو خاموشی سے صرف سوال سن لیا کوئی جواب نہیں دیا پھر خانقاہ میں دوسرے لوگوں کی موجودگی میں حضرت تھانویؒ کے مرید کی نسبت سے صوفی صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا صوفی صاحب آپ نے جو بات پوچھی تھی اس کا جواب یہ ہے۔ شاہ صاحب کا یہ انداز وطریقہ صوفی صاحب کو کچھ اچھا نہ لگا جس کا اندازہ احقر کو اس وقت ہوا جس وقت انہوں نے اپنا پورا واقعہ شاہ جہاں پور کے زمانۂ قیام میں سنایا، احقر اس وقت لکھنؤ میں مقیم تھا اور وہیں سے شاہ جہاں پور آتا جاتا تھا۔ نور اللہ مراقدھم!

مفکر ملت حضرت مولانا ابوالحسن علی میاںؒ سے

ایک اہم اور یادگار ملاقات

ایک زمانہ میں غیر مقلدین نے جنہیں عرب کی نجدی سعودی حکومت میں رسوخ حاصل تھا انہوں نے اہل عرب کو اپنے سوا دوسرے طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو مبتدع اور شرکِ تقلید میں مبتلا ثابت کرنے کی ایک مہم چھیڑ رکھی تھی جس کی وجہ سے اہل ندوہ کی مقبولیت اور رسائی وہاں متاثر ہو رہی تھی، چنانچہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس سلسلہ میں ''اضواء'' (عربی) اور ''بصائر'' (اُردو) کے نام سے دو رسالے لکھے تھے اور راقم سطور سے بھی تقلید کے اثبات اور غیر مقلدیت کے نقصانات کے بارے میں کچھ لکھنے کی فرمائش یہ کہہ کر کی تھی کہ وہ ندوہ سے شائع ہو جائے گا، مولانا کی یہ فرمائش سنکر احقر نے عرض کیا کہ ندوۃ العلماء کا مسلک ومشرب تقلید بالخصوص حنفیت کے بارے میں کیا ہے؟ احقر کو اس سے پوری طرح واقفیت نہیں ہے، اس کی پوری صراحت کی جائے تو کچھ لکھا جا سکتا ہے جیسے دار العلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور کے مذہب ومسلک کے بارے میں وہاں کے بنیادی دستور میں یہ تصریح ہے کہ سنی حنفی اور چشتی ہوگا۔ ایسی کوئی تصریح ندوہ کے بنیادی دستور میں ہے یا نہیں؟ احناف کے علاوہ دوسرے ائمہ کے مقلدین یا سلفی حضرات دار العلوم دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور میں بھی پڑھتے ہیں لیکن وہ وہاں اپنے آپ کو کچھ الگ تھلگ ہی محسوس کرتے ہیں لیکن دار العلوم ندوۃ العلماء چونکہ بوقت تاسیس ہی ایک طرح سے ایک غیر مقلد ادارہ ہی کے طور پر قائم کیا گیا تھا اس کی وجہ سے وہ یہاں اسے کسی مسلک سے وابستہ ادارہ سمجھتے ہی نہیں ہے، ایسی صورت میں احقر آپ حضرات (اہل ندوہ) کی طرف سے کوئی صفائی کیسے پیش کر سکے گا، احقر کی اس گزارش کا جواب نہ تو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ

ہی نے کچھ دیا نہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ان کے معین و دست راست مولانا معین اللہ صاحب ہی نے ان کی کوئی اعانت فرمائی۔ اس سلسلہ میں وہ یادگار تاریخی بات بھی زیرِ قلم آجائے جب حکومت سعودیہ کی طرف سے کسی ترجمۂ قرآن وتفسیر شائع کرنے کا منصوبہ بن رہا تھا تو وہاں کے سلفی حضرات نے اپنے سلفی علماء کا ترجمہ وتفسیر کی اشاعت کیلئے کوششیں شروع کر دیں اور مودودی حلقہ نے تفہیم القرآن کی اشاعت کیلئے بھاگ دوڑ شروع کر دی، اس وقت حضرت مولانا علی میاںؒ سے رابطۂ عالم اسلامی نے بذریعہ تار دریافت کیا کہ تفہیم القرآن علمائے اہل سنت والجماعت کے نزدیک کیسی تفسیر ہے؟ چنانچہ مولانا نے احقر کے رفیق اور اپنے قریبی حاضر باش مولانا مرتضیٰ صاحب بستویؒ کو رابطۂ عالم اسلامی کے تار کے ساتھ احقر کے پاس بھیج کر تفہیم القرآن سے متعلق احقر کی رائے اور تاثرات دریافت کئے کیونکہ اس سلسلہ میں احقر نے مستقل طور پر جو کچھ کام کیا تھا اس کو مولانا نے پسند فرمایا تھا۔ احقر نے ایک مختصر سی تحریر ''نظر الامعان فی تفہیم القرآن'' کے عنوان سے لکھ کر بھیج دی جس کا حاصل یہی تھا کہ تفہیم القرآن میں ''اعتزال'' پایا جاتا ہے۔ رابطۂ عالم اسلامی کے ادارۃ القرآن الکریم میں تصحیح ومراجعہ کے ذمہ دار سیّد عنایت اللہ شاہ صاحب کاکاخیل کا مکتوب بھی احقر کے نام آیا جس میں موصوف نے لکھا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے حاشیۂ تفسیر کو مولانا علی میاںؒ (بلکہ ان کے بھی استاذ علامہ سیّد سلیمان ندویؒ) تو اُردو زبان میں سب سے اچھا ترجمہ وتفسیر قرار دے رہے ہیں اور اس کی طباعت و اشاعت کی حکومت سعودیہ سے تائید وتوثیق فرما رہے ہیں مگر مکہ میں ندوہ کے ایک معتمد .... ندوی اس کے بجائے مودودی صاحب کی گمراہ کن تفسیر تفہیم القرآن کی طباعت واشاعت کرانے کیلئے یہاں کوشاں ہیں، اس پر میری ان سے سخت گفتگو اور جھڑپ بھی ہوگئی، انتہیٰ

ایک زمانے میں جب ملک کی نام نہاد سیکولر حکومت نے اپنے خفیہ منصوبہ کے تحت پرائمری درجات کے بے شعور بچوں کے ''شدھی کرن'' کی نیت سے نمستے، نمسکار اور جے ہند، وندے ماترم وغیرہ جیسے مشرکانہ طریقہ سلام کو رواج دینے کے ساتھ ساتھ پرائمری درجات کی کتابوں میں ایسے مضامین کی بھرتی شروع کر دی جن کے پڑھنے کے بعد معصوم بچوں کے ذہن سے توحید ورسالت پر مشتمل خیالات و جذبات کی دھلائی ہو جائے اور وہ بے تکلف، بے جھجھک مندروں کی مورتیوں کی پوجا کو ایک خوش گوار ''دیش بھکتی'' سمجھ کر اس اپنے دلوں میں جگہ دے دیں، بقول اکبر ؏

دل بدل جائیں گے، تعلیم بدل جانے سے!

اس وقت الہ آباد میں مجیدیہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل جناب ریاض الدین احمد صاحب سکریٹری دینی تعلیمی کونسل ہمارے ہی محلہ میں رہتے تھے، وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ مولانا! اب تو اسکولوں میں بہت ہی خطرناک نصاب تعلیم آ رہا ہے، اس کا کیا حل ہو؟ احقر نے عرض کیا کہ حل تو ہے لیکن آپ لوگ اس پر عمل ہی ہمت نہ کریں گے۔ آپ کہہ دیں گے کہ مسلمان تعلیم میں بچھڑ جائیں گے، وہ حل یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں سے ہٹالیں اور عملی طور پر حکومت کو بتا دیں کہ آپ کو یہ کافرانہ، مشرکانہ نصاب تعلیم اپنے بچوں کو نہیں پڑھوانا ہے لیکن آپ کا حال تو یہ ہے کہ جولائی میں آپ کی لائن اسکولوں میں لگ جاتی ہے، اس طرز عمل سے نصاب سے نفرت ظاہر ہی نہیں ہوتی۔ وہ یہ سنکر خاموش ہو گئے، کچھ دنوں کے بعد احقر لکھنؤ حضرت مولانا علی میاںؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اپنی یہ گفتگو نقل کی تو موصوف نے اسے پسند فرمایا اور فرمایا کہ خدا کرے آپ کی یہ بات لوگوں کو سننے کی توفیق ملے اور وہ اسے سنیں اور مانیں۔ اسکے بعد مولانا نے بھی اعلان فرما دیا کہ تمام مسلمان اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں سے اُٹھالیں جہاں ایسا نصاب پڑھایا جاتا ہو اور

صاف صاف کہہ دیں کہ ہم یہ نصاب نہیں پڑھائیں گے۔ مولانا کا یہ اعلان فرمانا تھا کہ بنیا حکومت کو اپنی بدبختی دکھائی دینے لگی، نصابی کتابوں کی اشاعت پر کافی رقم خرچ ہو چکی تھی جو ضائع ہو جاتی چنانچہ حکومت نے اپنی پالیسی کا نفاذ اس وقت روک دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کیلئے جس کسی نے بھی ''مفکر ملت'' کا لقب تجویز کیا وہ بہت صحیح اور مناسب حال لقب تجویز کیا۔ واقعۃً مولانا ایک مفکر، مخلص، مؤرخ، ادیب، بامروت، نجیب الطرفین شریف آدمی تھے۔

بھلانا ان کا مشکل ہے، وہ ہر دم یاد آتے ہیں
کڑی گھڑیاں جب ہوتی ہیں، تو پیہم یاد آتے ہیں
اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی
شاہیں ہیں بھلا کیسے پرواز نہیں آتی

مولانا سیّد فاخر علی مراد آبادیؒ امام جامع مسجد مراد آباد

۱۳۶۶ھ میں مدرسہ عالیہ امدادیہ مراد آباد میں احقر مدرس دوم تھا، اُسی زمانہ میں ''جمعیۃ علماء ہند'' کے مقابل حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی صدارت اور شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی نیابت کے زمانہ میں مراد آباد میں بھی ''جمعیۃ علماء اسلام'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مولانا سیّد فاخر علی امام جامع مسجد مراد آباد کو صدر اور احقر کو نائب صدر مقرر کیا گیا تھا، مراد آباد کا زمانہ قیام بہت مختصر رہا، لیکن بہر حال وہاں کا قیام یادگار تھا۔

جناب محترم اشرف علی خاں صاحب مغفور و مرحوم

اس تذکرہ میں جس کا آغاز حضرت اشرف العلماء مولانا تھانوی کے تذکرۂ اشرف سے شروع ہوا تھا اب جبکہ یہ تذکرہ ختم ہونے کے قریب پہنچ رہا ہے اُس میں اپنے ایک بہت ہی مخلص اور باشرف و سعادت شخصیت کا تذکرہ بھی ضرور آ جانا چاہئے، وہ شخصیت ہے جنکی مغفرت تو اُن کی شہادت ہو جانے کی وجہ سے یقینی سی ہو گئی ہے۔ احقر کو آگرہ کے زمانۂ قیام میں ایک موقع پر یہ اطلاع ملی کہ موصوف علیگڑھ سے دہلی گئے ہوئے تھے اور دہلی میں سٹی بس کے ذریعہ اُنہیں کہیں جانا تھا جلدی میں وہ غلطی سے کسی دوسری بس پر سوار ہو گئے، سوار ہو جانے کے بعد معلوم ہونے پر اُس بس سے اُتر گئے ابھی اترے ہی تھے کہ اچانک کسی تیز رفتار دوسری بس کی زد میں آ کر شہید ہو گئے، اس واقعہ کی اطلاع پا کر احقر اُن کے مکان پر تعزیت کیلئے حاضر بھی ہوا تھا۔ موصوف سے میرا تعارف مراد آباد میں ہوا تھا، وہاں احقر کو راشن کارڈ بنوانا تھا جس محلہ میں میرا قیام تھا اُس محلہ کا راشننگ دفتر قریب ہی تھا وہاں یہی اشرف علی خاں صاحب ایریا راشننگ افسر تھے، اُن سے تعارف ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ اُنہوں نے کرسچین کالج الہ آباد میں تعلیم حاصل کی تھی اور ہمارے بابا جان انوار الحق صاحب کے وہ شاگرد تھے۔ اُنہوں نے اُن سے اس کالج میں تقریباً تین سال پڑھا تھا، ہمارے والد صاحب سے بھی خوب واقف تھے، میرے زمانۂ قیام مراد آباد میں جب والد صاحب وہاں تشریف لائے تو اُنہوں نے اُنہیں اپنے یہاں مدعو بھی کیا تھا، آگرہ کے زمانۂ قیام میں ایک روز اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ جامعہ اُردو علیگڑھ کے رجسٹرار جناب اشرف علی خاں صاحب مقرر ہوئے ہیں تو خیال ہوا کہ شاید یہ وہی ہوں چنانچہ ایک روز علیگڑھ کے محلہ دودھ پور میں اُن کے مکان جا پہنچا جہاں اُن کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی مگر یہ کیسے پتہ چلتا کہ یہ وہی اشرف علی خاں صاحب ہیں تو

احقر نے دروازہ پر دستک دی، اُن کے صاحبزادے مسعود اشرف سلمہٗ باہر آئے، اشرف علی خاں صاحب دفتر جا چکے تھے، احقر نے صاحبزادہ سے کہا کہ اپنی والدہ صاحبہ سے دریافت کیجئے کہ آپ لوگ کبھی مراد آباد میں بھی رہ چکے ہیں؟ سوال کا جواب وہاں سے اثبات میں ملا تو احقر باہری کمرے میں ٹھہر گیا، شام کو دفتر سے واپسی پر موصوف سے ملاقات ہوئی اور کچھ قیام بھی رہا۔ اِس کے بعد بھی برابر آنا جانا ہوتا رہا، موصوف نے جامعہ اُردو کے امتحانات کیلئے مجھ کو ممتحن بھی بنا دیا تھا۔

عزیزم مسعود اشرف سلّمہٗ

اُنکے سعادت مند صاحبزادہ عزیزم مسعود اشرف سلمہٗ اپنی خاندانی شرافت اور وضع داری کے تحت احقر کو بھولے نہیں ہیں، کچھ دنوں پہلے اپنے اسکول کے طلباء کو غالباً ٹور پر لیکر نکلے تھے اور آگرہ بھی آئے تھے تو ملنے کیلئے آشیانہ بھی تشریف لائے مگر آشیانہ صرف بسیرا ہی ہے کہ مسافر وہاں رات کو سو رہیں، ناشتے کھانے سے باقاعدہ کسی کی تواضع نہیں ہو سکتی، پھر وہ میرے قیام سہارنپور میں بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ جلال آباد جاتے ہوئے آئے، عزیزم سلمہٗ سے اُن کے مخلصانہ ومحبانہ تعلقات ہیں اور یہ دونوں ہی اپنے آبائی تعلق اور رشتۂ خلوص ومحبت کے ساتھ ایک دوسرے سے برابر ملتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے للہ فی اللہ تعلق کو دنیا سے آخرت تک برقرار رکھے۔ آمین

جناب ریاض الدین صاحب پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

اور ان کے قریبی عزیز

جناب زین العابدین صاحب اور ماسٹر نذیر احمد صاحب

احقر ۱۹۷۰ء میں آگرہ آیا تھا، یہاں آنے سے پہلے دولت حسین مسلم اسکول میں پڑھا چکا تھا اور اس سے پہلے مجیدیہ اسلامیہ کالج میں پڑھاتا تھا۔ اسکولوں میں اس وقت جو نصاب، تعلیم کیلئے لاگو کیا جا رہا تھا وہ اہل اسلام کے کم سن اور بے شعور بچوں کو شدھی کرنے کی ایک منصوبہ بند کوشش تھی چنانچہ سلام کی جگہ نمستے اور نمسکار اور جے ہند، وندے ماترم وغیرہ کفریہ شرکیہ الفاظ دھیرے دھیرے رواج پکڑ رہے تھے۔

احقر الہ آباد میں جہاں رہتا تھا پرنسپل صاحب موصوف اسی کے قریب ہی رہتے تھے، ان کے برادرِ نسبتی ماسٹر نذیر احمد صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات تھے، ۱۹۶۰ء میں ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھاتے تھے اور ایک ہی مردانہ مکان میں رہتے تھے جس میں ایک شیعی ماسٹر رضوی صاحب بھی رہتے تھے، وہاں ہم دونوں کی بھی رہائش تھی۔ بعد عصر ہم دونوں بستی سے باہر ٹہلنے چلے جاتے اور مغرب تک تفریح رہتی، وہیں جہاں موقع ملتا احقر اپنا رومال بچھا کر نمازِ مغرب ادا کرتا اور ماسٹر صاحب ٹہلتے رہتے، میں نے انہیں ان کے اس انداز پر کبھی ٹوکا بھی نہیں لیکن آدمی شریف تھے زیادہ دنوں تک یہ علیحدگی نہ رکھ سکے اور پھر صرف مغرب ہی کی نہیں بلکہ پنج وقتہ باجماعت نمازوں کے پابند ہو گئے، ان کی اہلیہ بھی ایک اچھے دیندار گھرانے کی خاتون تھیں، میرے اہل خانہ سے تعلقات تھے، آتی جاتی تھیں۔ انہوں نے ماسٹر صاحب کی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور خوشی کا اظہار بھی کیا کہ ماسٹر صاحب مولانا صاحب کے ساتھ رہنے سے نمازی ہو گئے۔

Scanned by CamScanner

الہ آباد کے زمانۂ قیام میں میری ملازمت کا تعلق ان دونوں کالجوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج الہ آباد سے بھی رہا اور بعض انگریزی پڑھنے والوں کو عربی، فارسی یا اُردو پڑھانے کا سلسلہ بھی رہا۔ اسی زمانہ میں بعد عصر ہم ایک ماسٹر نور صاحب ناردی کی دُکان پر بیٹھ جایا کرتے تھے (جن کی بینائی حد درجہ کمزور تھی جس کی وجہ سے ملازمت نہ کر سکتے تھے) ایک دن جب مجھے آگرہ کے مفتیٔ شہر ہونے کی حیثیت سے اپنے وطن الہ آباد کو خیر باد کہنا پڑا تو ماسٹر زین العابدین صاحب نے بہت با معنی اور برمحل انگریزی محاورہ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ آپ یہاں ''مِس پلیس'' ہو گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن ظن کے مطابق لاج رکھی اور جامع مسجد آگرہ میں مفتیٔ شہر کی معزز جگہ دی اور اہل شہر کے دلوں میں عزت کا مقام بھی دیا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ایک دیندار، شریف، تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا کیا، دین کی راہ پر چلایا اور ہر قسم کی فکری گمراہی اور زیغ و ضلال سے محفوظ رکھا۔ فللہ الحمد وله الشکر

اپنی کہانی اپنی زبانی

سن ہجری ۱۳۴۱ کی عید جمعہ کے روز ہوئی تھی، باسی عید کے روز والد محترم مولانا محمد سراج الحق صدیقی مچھلی شہری اُستاذ عربی و فارسی گورنمنٹ کالج الہ آباد کے گھر واقع محلہ سبزی منڈی، شاہ گنج کے سرائے شجاعت خاں میں اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایک دوسرا بیٹا مرحمت فرما کر باسی عید کی خوشی کو تازہ اور دوبالا فرما دیا، جد مرحوم حافظ قاری فضل حق علیہ الرحمہ نے عبد القدوس عرف رومی نام تجویز فرمایا اور والد محترم نے شمس الحق۔ آپ حضرات اِس وقت ۸۸ سالہ مریض و معذور جس رومی کو دیکھ رہے ہیں یہ اُس وقت بہت ہی نحیف الجثہ اور قصیر البنیان نومولود بچہ تھا جو دنیا کی ہنگامہ آرائی دیکھنے کے شوق میں ساتویں ہی مہینہ منصۂ شہود پر نمودار ہو گیا تھا۔

بالکل ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی جہاں اُس وقت بھی دینی ماحول بفضلہٖ تعالیٰ زندہ تھا، حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کی ہدایت کے مطابق اس بچہ کو اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ زبانی یاد کرائے گئے۔ راقم سطور صبح سویرے ہی یہ اسمائے حسنیٰ گھر کے سب لوگوں کو زبانی کہلوایا کرتا تھا (یہی اس کا سب سے پہلا سبق تھا جو والد محترم و مرحوم نے اس کو پڑھایا تھا)۔ گھر کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے بڑے بھائیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اسکولوں کے بھی چکر لگتے رہے، سات سال کی عمر میں مدرسہ تجوید القرآن (الہ آباد) میں داخل ہو کر حفظ قرآن مجید شروع کیا، تقریباً پونے تین سال کی مدت میں بحمدہٖ تعالیٰ حفظ قرآن مجید مکمل کیا۔ مدرسہ سبحانیہ جامع مسجد الہ آباد میں قاری محب الدین صاحب کے ہاتھوں دستار بندی ہوئی تھی، طلباء حفظ میں شاید سب سے کم عمر حافظ راقم سطور ہی تھا۔ اسی زمانہ میں الہ آباد سے والد صاحب سے تبادلہ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی وجہ سے میری تعلیم بھی متاثر

ہوتی رہی۔ ۱۹۳۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں کچھ فارسی تعلیم کے ساتھ عربی تعلیم بھی شروع ہوگئی تھی، برادرِ محترم مولانا عبدالرحمٰن جامی مدرسہ جامع العلوم کانپور میں عربی پڑھ رہے تھے مگر وہ وہاں اپنی تعلیم سے مطمئن نہ تھے، اس وجہ سے مظاہر علوم چلے آئے۔ ۱۹۳۷ء میں احقر بھی اپنی مادرِ علمی اور محبوب درسگاہ مظاہر علوم میں پہنچ گیا جہاں سے ۱۳۶۳ء مطابق ۱۹۴۴ء میں دورۂ حدیث شریف پڑھ کر فراغت ہوئی۔ فراغت کے بعد متصلاً رشتۂ ازدواج کیساتھ نئی دنیا میں داخل ہوگیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کی پندرہ سالہ مدت میں اللہ تعالیٰ کی فضل فرمائی ونعمت ارزانی کی بدولت سات اولادیں مرحمت ہوئیں جو ماشاءاللہ سبھی صاحب اولاد ہو چکی ہیں۔ فللہ الحمد

مظاہر علوم سے فراغت اور رشتۂ ازدواج میں انسلاک کے بعد سب سے پہلی ملازمت مدرسہ انوار القرآن، بہادر گنج، الہ آباد میں کی اور تھوڑے ہی دنوں بعد مدرسہ عالیہ امدادیہ مرادآباد میں مدرس دوم کی حیثیت سے تقرر ہوگیا، جہاں مختصر المعانی، حماسہ اور مشکوٰۃ شریف پڑھانے کو ملیں۔ وہیں سے الہ آباد بورڈ کے عالم عربی اور اُردو کی ''اعلیٰ قابلیت'' کے امتحانات دئے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت میرا قیام لکھنؤ میں تھا جہاں سنی انٹر کالج میں عربی و فارسی کے معلم کی حیثیت سے رہا۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ''فاضل ادب عربی'' اور ''دبیر کامل فارسی'' کے امتحانات فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کئے۔ ۱۹۴۸ء میں ناتھورام گوڈسے نے مسٹر گاندھی کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا اس موقع پر سنی کالج لکھنؤ میں تعزیتی قرارداد پاس ہوئی جس میں پرنسپل صاحب نے لکھا تھا کہ ہم کو چاہئے کہ ہم لوگ اُنہی اُصولوں کی پیروی کریں جن کی خاطر مہاتما گاندھی نے ''جامِ شہادت'' نوش کیا۔ پرنسپل صاحب نے آخر میں پوچھا کہ آپ حضرات کو اس تعزیتی تجویز سے اتفاق ہے، میں نے صاف کہا نہیں! اُنہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا آپ گاندھی جی کی روحانیت کے قائل

نہیں ہیں؟ میں نے کہا لا حول ولاقوۃ الا باللہ اُس کی روحانیت کا میں کیوں قائل ہوتا! چنانچہ میں نے زبانی اور تحریری طور پر عدم اتفاق ظاہر کر دیا۔ دوسرے روز اُسی کالج کے بعض اساتذہ کی فرمائش پر میں نے اُس کی تاریخ نکالی:

سن ہجری تھا تیرہ سو سرسٹھ — جب کہ مارا گیا لئیم رجیم
فکر تاریخ تھی ندا آئی — ''کافر مردہ رفت سوئے جحیم''

۷ ۶ ۳ ۱ ھ

یہ قطعہ تاریخ سن کر استاذی حضرت مولانا عبدالوحید صاحب فتح پوریؒ نے بہت پسند کیا تھا۔

اسی زمانہ قیامِ لکھنؤ میں عزیزؔ لکھنوی کے شاگردِ خاص لکھنوی اُردو زبان و ادب میں سند کا درجہ رکھنے والے نواب جعفر علی خاں آثرؔ لکھنوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے تعارف اور تعریف کیلئے خود انہی کا شعر کافی ہے۔

آثرؔ ہے نام، وطن لکھنؤ، عزیزؔ استاد — نکالتا ہوں نئے راستے زباں کیلئے

اُنہوں نے اپنا دیوان انتخاب کیلئے یہ کہہ کر مجھ کو دیا کہ ''شاعر اپنے کلام کا انتخاب خود نہیں کر سکتا'' چنانچہ میں نے انکی بیاض میں پسندیدگی کے نشانات لگا کر انتخاب کر دیا تھا۔ انکے مجموعۂ کلام کا نام ہے ''اثرستان''۔ دورانِ انتخاب میں نے آثرؔ صاحب کی ایک غزل پر منظوم تنقید بھی لکھ دی تھی جس کو پڑھ کر اُنہوں نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا اور میری تنقید کی تعریف و تحسین کی۔ اس موقع پر آثرؔ صاحب نے اپنے تاثرات پر مشتمل جو مکتوب مجھے لکھا تھا وہ یہ تھا

مکرمی تسلیم

گرامی نامہ باعث افتخار ہوا، مرسلہ غزل پڑھی بہت محظوظ ہوا، یوں تو پوری غزل مرصع ہے، کئی شعر خاص طور پر پسند آئے۔ سادگی میں پر کاری۔ یہی اچھے شعر کا معیار ہے، وہ آپ کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

عشق بھی ہو، سکوں بھی ہو کیا خوب	وعدہ ہاں کیوں وفا کرے کوئی
دل کو سمجھایا لاکھ لاکھ مگر	جو نہ سمجھے تو کیا کرے کوئی
وعدہ کرنا بھی کوئی مشکل ہے	بات جب ہے وفا کرے کوئی
جانِ رومؔی ہے کیسی مشکل میں	اس کا اندازہ کیا کرے کوئی

پہلا قطعہ وحدت وجود کے ثبوت میں کس قدر حسین اور مدلل ہے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ آپ کا حال بتا سکیں گے ان سے دریافت کرتا رہا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ پاکستان تشریف لے گئے اور اس وثوق سے کہ سندھ کے فلاں علاقہ میں قیام ہے!

میں اب اکثر بیمار رہتا ہوں۔ ڈاکٹروں کو اندیشہ ہے کہ مثانے میں ٹومر ہو گیا ہے اور بمبئی مشورے کیلئے جانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ابھی میں نے کچھ طے نہیں کیا۔ عمر بھی ستر برس کے قریب ہوئی۔ آخر کہاں تک؟ بہت جیا۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

نیاز مند

آثؔر

۱۹/ستمبر ۱۹۵۳ء

کشمیری محلہ، لکھنؤ"

۱۹۴۸ء مدرسہ عربیہ قرآنیہ الہ آباد میں حضرت قاری حبیب احمد صاحب علیہ الرحمہ کے ساتھ مدرس دوم رہا اور ان کے بعد صدر مدرس ہو گیا تھا، وہیں سے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل (گجرات) میں مدرس سوم کی حیثیت سے گیا تھا جہاں حسامی، شرح عقائد، سلم العلوم اور سبعہ معلقہ وغیرہ پڑھانے کو دی گئیں۔ وہاں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی علیہ الرحمہ کے بڑے صاحبزادہ مولانا عمر احمد تھانوی سے خط و کتابت ہوئی اور انکی طلب پر ڈھاکہ چلا گیا مگر وہاں کی زبان اور وہاں کے ماحول سے مانوس نہ ہونے کی بناء پر اسی سال الہ آباد واپس آ گیا۔ حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی مردم شناسی اور میری مزاج شناسی کی بنیاد پر میرے ذریعہ ماہنامہ "الاحسان" کا اجراء کرا کے مجھے اسکا مرتب و مدیر بنا دیا تھا۔ اس رسالہ کے ذریعہ مرشدی حضرت مصلح الامت مولانا الشاہ وصی اللہ رحمہ اللہ "غریق بحر رحمت" کے ملفوظات و افادات "تعلیماتِ شیخ" کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوئے جو بعد میں "معرفت حق" پھر "وصیۃ العرفان" میں شائع ہوتے رہے۔ یہ رسالہ اور اس کے علاوہ حضرت حکیم الامت کی بعض کتابیں اور مصلح الامت کے بعض رسائل مکتبۂ جامی واخولۂ، حسن منزل، الہ آباد سے شائع ہوتے تھے۔ مکتبہ کا یہ نام میں نے ہی تجویز کیا تھا۔ اسی دور میں الہ آباد کے ایک گمنام قدیم مدرسہ احیاء العلوم (مسجد شیخ عبداللہ کانجو روڈ الہ آباد) کا احیاء بھی عمل میں آیا تھا اور احقر کو اس مسجد میں امام مقرر کیا گیا تھا۔ میرا یہ دور دن بھر کی زبردست بھاگ دوڑ کا دور تھا، میرا قیام تو حسن منزل اور صمد آباد میں رہتا، وہاں سے پنج وقتہ نماز کی امامت کیلئے مسجد عبداللہ پہنچنا اور ظہر کی نماز کے بعد مدرسہ نعمانیہ کٹرہ میں پڑھانا اور پھر عصر کی امامت کیلئے مسجد عبداللہ پہنچنا یہ ساری بھاگ دوڑ کبھی پیدل کبھی رکشے کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ الہ آباد کے ڈاکٹر ناظم سلمہٗ جنہوں نے دولت حسین کالج میں مجھ سے اُردو پڑھی تھی اور میری بھاگ دوڑ کی زندگی

سے واقف تھے میری معذوری لنگ کو دیکھ کر تعجب سے کہنے لگے کہ ’’آپ تو پیدل بہت چلتے تھے آپ کو یہ بیماری کیسے ہوگئی؟‘‘ میں نے کہا ’’آپ ڈاکٹر ہیں، آپ ہی بتائیے؟‘‘

مشاہیر الہ آباد

اس عنوان کے تحت جو کچھ لکھنا چاہتا تھا وہ الہ آباد کے دائروں کے چکر میں چکرا گیا اور بات کہیں سے کہیں چلی گئی، مشاہیر الہ آباد کے زیر عنوان احقر صرف انہی حضرات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے جن کی زیارت و خدمت اُسے نصیب ہو سکی ہے اسی سلسلہ میں الہ آباد کے دائروں کا ذکر آ گیا، وہاں کا ایک مشہور و معروف دائرہ حضرت شاہ اجمل علیہ الرحمہ کے نام سے موسوم ہے، یہ دائرہ الہ آباد کے چند دائروں میں سے ایک مشہور دائرہ ہے، اُردو شعراء میں دوسرے دور کے مشہور شعراء آتش و ناسخ لکھنوی کافی شہرت رکھتے ہیں، ان دونوں میں باہم نوک جھونک بھی رہتی تھی جس کا اندازہ آتش کی غزل کے مقطع سے کیا جا سکتا ہے۔

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے　　　آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا؟

ناسخ لکھنوی حضرت شاہ اجمل علیہ الرحمہ کے معتقد تھے، اسی عقیدتمندی میں وہ جب دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد آتے تو وہاں سے لکھنؤ کی واپسی جلد نہ ہو پاتی تھی، اس صورت حال کو انہوں نے اپنے اس شعر میں نہایت عمدہ پیرایہ میں پیش کر دیا ہے۔

ہر پھر کے دائرہ سے نکلتے نہیں قدم　　　آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

دائرہ شاہ اجمل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دائرہ شاہ غلام علی ہے جسے ملا محمدی شاہ کا دائرہ بھی کہا جاتا ہے، شاہ غلام علی صاحب علیہ الرحمہ تو کسی درجہ میں قدیم بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ملا محمدی شاہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے زمانہ

میں موجود تھے اور حضرت نے ان سے ملاقات بھی کی تھی اور اپنی مثنوی ’’زیر و بم‘‘ بھی کچھ سنائی تھی، اسی دائرہ میں اسی **سلسلۂ چشتیہ کے ایک بزرگ شاہ عبدالشکور صاحب** بھی گزرے ہیں، الہ آباد میں احقر جب قرآن مجید حفظ کر رہا تھا اسی زمانہ میں ان کی وفات ہوئی تھی اور احقر نے ان کے جنازہ کا مجمع دیکھا تھا، ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالرؤف صاحب سجادہ نشیں ہوئے، یہ قانون گوئی کے راستے سلوک طے کر کے گدی نشیں ہوئے تھے، ان کے صاحبزادہ عبدالمعبود صاحب اور ہمارے والد صاحب کے درمیان بہت گہری رفاقت و دوستی تھی۔ پیر ہونے کی وجہ سے ان کے پاس مریدین کی خاصی بھیڑ بھی تھی جن کی وجہ سے والد صاحب کو بھی کچھ تقویت رہی ہے، شاہ عبدالمعبود صاحب حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب علیہ الرحمہ سے بھی تعلق رکھتے تھے اور کسی قدر اہل حق کے مسلک سے بھی تعلق تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد اکبر الہ آبادی کے اس شعر پر عمل ہی کو اپنے حق میں بہتر سمجھ کر پوری طرح پیر ہی بن گئے۔ اکبر نے کہا ہے۔

با ادب بن کر جو بیٹھو قوم کی گالی سنو　　　بے ادب بن کر جو بیٹھو طعنۂ حالی سنو
دی مجھے شیخ طریقت نے یہ کیا عمدہ صلاح　　　شیخ بن کر بیٹھ جاؤ ڈٹ کے قوالی سنو

اچھے آدمی تھے۔

الہ آباد کی شہرت میں وہاں کے علمی و قانونی پہلو کو خاص دخل ہے کہ صوبہ کے مقدمات وہیں حل ہوتے ہیں، ہائی کورٹ کی وجہ سے وہ ججوں اور وکیلوں، بیرسٹروں کا مشہور شہر بن گیا ہے اور وہاں کے امرودوں نے اس کی شہرت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے دونوں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اب الہ آباد میں ساماں کہاں بہبود کے　　　اب دھرا کیا ہے یہاں بجز اکبر کے اور امرود کے

مشاہیر الٰہ آباد جیسے عنوان کے تحت کچھ تو لکھ چکا ہوں اب چند حضرات کے صرف اسماء گرامی لکھ کر اس عنوان کے تحت اپنی پریشاں نگاری کو ختم کرنا ہی بہتر سمجھ میں آتا ہے۔ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والوں میں والد محترم کے تعلقات مندرجہ ذیل حضرات سے اچھے خاصے تھے، ان سب کو میں نے بھی دیکھا اور ان میں سے بعض کے متعلقین کو پڑھانے کا بھی موقع ملا ہے۔ عربی و فارسی کے پروفیسر مولانا محمد علی نامی، ڈاکٹر زبیر احمد، ڈاکٹر محمد احمد، ڈاکٹر رفیق جو اپنے گھر بھی عربی ہی میں بول چال رکھتے تھے، عبداللطیف الہندی، اُردو کے مشہور شاعر اصغر حسین اصغر جن کے دو دیوان ''نشاط روح'' اور ''سرود زندگی'' میں سے ایک پر مقدمہ ابوالکلام آزاد نے اور دوسرے پر اُردو کے مشہور شاعر اقبال سہیل نے لکھا ہے کہ جن کا یہ شعر نوحہ خوانوں کے منہ پر زبردست طمانچہ کا کام کرتا ہے۔

وہ روئیں جو منکر ہوں حیات شہداء کے ۔۔۔ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

ایک موقع پر اصغر صاحب اپنے گھر سے باہر کہیں مشاعرہ میں گئے تھے اور والد صاحب سے کہہ گئے تھے کہ میرے گھر میں صرف عورتیں ہی ہیں، رات کو روی میرے گھر پر سو جایا کریں، مجھے گھر سے باہر سونے میں تردد تھا مگر اُس وقت والدہ صاحبہ الٰہ آباد میں نہیں تھیں، اس لئے مجھے ان کی شہ نہیں مل سکتی تھی، مجبوراً جانا ہی پڑا تھا۔ اصغر صاحب کے گھر میں ان کی اہلیہ اور ان کی بہن بھی رہتی تھیں، محلہ جانسین گنج کی ایک گلی میں ان کا مکان تھا، ان دونوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ کچھ سناؤ! ہمارے گھر پر لکھنؤ سے النجم آتا تھا، اس میں آثر زبیری کی یہ ''منقبت صحابہؓ'' شائع ہوئی تھی

اللہ نے زینت بخشی ہے افلاک کو روشن تاروں سے ۔۔۔ اسلام نے رونق پائی ہے محبوب خدا کے یاروں سے

میں نے یہ پوری نظم یاد کر رکھی تھی، سنائی، نظم سن کر وہ مسکرائیں غالباً

مسکرانے کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ بیٹے پر بھی اپنے باپ کی طرح ردِ شیعت کا اثر ہے۔

راقم سطور جو محلہ سبزی منڈی شاہ گنج میں ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۳ء کو موجود عالمِ فانی میں بالکل گمنام طور پر نو واردین میں شامل ہوا تھا تقریباً دس بارہ سال تک الٰہ آباد ہی کے مختلف محلوں میں رہا تھا، اس زمانہ میں وہاں جن مشاہیر اور بزرگوں کو دیکھ سکا یا ان کی خدمت میں کچھ بیٹھ سکا ان بزرگوں میں سے بعض کے صرف اسمائے گرامی یہاں لکھ رہا ہوں، ان میں سے بعض ایسے بزرگوں کا مختصر تذکرہ بعد میں لکھوں گا۔

الٰہ آباد میں خانقاہ اور دائرہ کے عنوان سے مشہور تو یہی ہے کہ بارہ دائرے ہیں لیکن میں شاید سب کو یاد رکھ ہی نہیں سکا یا سب کو یاد رکھنے میں ناکام رہا۔

(۱) **دائرہ شاہ محب اللہ الٰہ آبادیؒ** جن کے خلیفہ حضرت شاہ محمدی فیاضؒ کا مزار بالکل غیر معلوم المقام اور گمنام طور پر شہر آگرہ کے محلہ موتی کٹرہ میں ایک مکان میں ہونے کی وجہ سے ظاہر و آشکارا نہ تھا۔ حکیم الامت اشرف العلماء حضرت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی کتاب تعلیم الدین میں ''مشائخ سلسلہ'' کے ذکر میں محلہ موتی کٹرہ آگرہ میں ان کے مزار کی نشان دہی فرما کر اہل سلسلہ کیلئے زیارت و فاتحہ خوانی کی سہولت فرما دی۔ حضرت موصوف کے مختصر حالات ''تعلیم الدین'' یا ''مناجات مقبول سراجی'' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

(۲) **دائرہ شاہ حجۃ اللہؒ**، یہ دائرہ بھی اسی کے قریب ہی کچھ فاصلہ پر موجود ہے، احقر نے اسی دائرہ کے سجادہ حضرت شاہ نعمت اللہ علیہ الرحمہ اور ان کے جانشین شاہ عبید اللہ صاحب کو دیکھا ہے۔ مؤخر الذکر سے خوشگوار تعلقات بھی رہے ہیں۔

(۳) **دائرہ شاہ اجملؒ**، اس دور کے دو سجادہ نشینوں کو اچھی طرح دیکھا ہے، ایک صاحب کا نام تو شاہد فاخری تھا جو کانگریس کے خصوصی لوگوں میں شمار ہوتے

تھے، حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند جو تحریک آزادی سے متعلق ۱۹۴۲ء کے اندولن میں گرفتار ہوکر نینی جیل الہ آباد میں اسیر رہے تھے، ان کی رہائی رمضان المبارک میں ہوئی تھی، رہائی کے بعد وہ ان ہی شاہد فاخری صاحب کے دائرہ میں تشریف لائے تھے، عصر و مغرب کی نماز وہیں پڑھی تھی، وہیں روزہ افطار کیا تھا، احقر بھی اس پُر مسرت تقریب میں شریک ہوا تھا اور وہیں زیارت و ملاقات بھی کی تھی۔

دار العلوم کے زمانۂ تعلیم میں مولانا اسیری کے دور سے گزر رہے تھے، دار العلوم میں مولانا فخر الدین صاحب شیخ الحدیث شاہی مسجد مراد آباد موصوف کی قائم مقامی کر رہے تھے۔

(۴) **دائرہ شاہ غلام علی** جو بعد میں دائرہ ملا محمدی کے نام سے مشہور ہوا، اس محلہ میں ہمارے گھر کے لوگوں کا قیام عرصۂ دراز تک رہا، بہت دنوں تک کرایہ کے مکانوں میں رہے، پھر اسی محلہ کے ایک حصہ میں منشی صابر حسین صاحب جن کے کئی مکانات تھے ان سے ایک مکان خرید کر ذاتی مکان بھی وہیں بنالیا تھا، اسی مکان میں میری شادی بھی ہوئی تھی پھر بعد میں والد صاحب کے تبادلہ کے بعد فتح گڑھ اور فتح پور، کانپور وغیرہ رہنے کے بعد پھر وہیں واپسی ہوگئی تھی۔ شادی کے بعد الہ آبادی سے جامی صاحب فتح پور چلے گئے اور پھر وہاں سے حضرت مصلح الامت علیہ الرحمہ کے یہاں جم گئے اور احقر پہلے مراد آباد پھر لکھنؤ چلا گیا۔ لکھنؤ سے دو تین سال بعد واپسی ہوگئی تو ایک سفر مشرقی پاکستان ڈھاکہ کا ہوا جہاں مستقل اقامت پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی تو وطن پیدائش الہ آباد واپس آگیا اور الہ آباد میں اسلامیہ کالج اور دولت حسین ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازمت و معلمی کرتا رہا۔ نومبر ۱۹۷۰ء میں جب کہ ۱؍ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ ایک ساتھ ایک دن کے فرق کے ساتھ چل رہے تھے،

شہر آگرہ کی مشہور تاریخی جامع مسجد میں قائم مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس اور دار الافتاء کے مفتی شہر کی حیثیت سے یہ راقم سطور الہ آبادی زبردستی اکبر آبادی بن گیا۔

سنی اسکول، لکھنؤ میں میرے ایک رفیق تدریس ماسٹر عبداللہ خاورؔ تھے جو حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی ؒ سے بیعت و استرشاد کا تعلق رکھتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے اور اتفاق سے اسی کالج میں استاد ہوگئے جہاں میرے تایا مرحوم انوار الحق صاحب پرنسپل تھے، ان کے ریٹائرڈ ہونے پر انہوں نے ایک ''الوداعی نظم''، لکھی تھی جس کا ایک مصرعہ یاد آگیا جس کو یادوں کے چراغ میں ضرور محفوظ کرلیا جائے ع

ساٹھ سالہ نوجواں جاتا ہے آج

موصوف نے کراچی سے مجھے نامۂ منظوم لکھا تھا، میں نے بھی اس کا جواب نظم ہی میں لکھ دیا تھا۔ دونوں ملاحظہ فرمالیجئے۔

مکتوبِ خاورؔ

صبا گزر جو کبھی ہو دیارِ رومی سے ۔۔۔ سلام شوق بصد عجز و التجا کہیے
زباں پہ لائیں اگر بھول کر وہ نام مرا ۔۔۔ تو اشتیاق و تمنا کا ماجرا کہیے
جو مسکرائیں مرے صبر کا گلہ کیجئے ۔۔۔ شکن جبیں پہ جو آئے مجھے برا کہیے
زباں پہ لائیں وہ شام اودھ کا جو مذکور ۔۔۔ سحر ترازیٔ گیسو کا ماجرا کہیے
کہیں جو صبح بنارس کا نام آجائے ۔۔۔ تمام کیف و کم چشم نیم وا کہیے
سواد ساحل جمنا کی کیجئے باتیں ۔۔۔ نسیم وادیٔ گنگا کا ماجرا کہیے
ہوائے شوق وطلب کی طرف کنائے ہوں ۔۔۔ لطیف اشاروں میں غم ہائے جاں گزا کہیے
زمانے کے ستم و لطف کا گلہ کیجئے ۔۔۔ وہ خود ہی حال سمجھ لیں گے اور کیا کہیے

اور اب بھی جو ہوں پرسانِ حال خاور کے — خراب و خستہ و رنجور و بے نوا کہئے
کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجئے — کبھی حکایت صبر گریز پا کہئے
وہی سحر رہی شام ملال اور شب غم — کسی کا لطف کسی کا ستم رہا کہئے
وطن سے دور وہ کچھ اور بھی تباہ ہوا — گزر رہی ہے بہر حال اور کیا کہئے
گریز کیجئے مرے غم سے پوچھئے احوال — کیا زمانے نے تم سے سلوک کیا کہئے
ہمارے نامے پہ خاموش کیوں رہے حضنا — بس اک سکوت میں سارا جواب تھا کہئے
برا جو مانئے ہم سے تو آپ کو ہے قسم — زرا بھی میری خطا ہو تو برملا کہئے
جواب دیجئے تا دل کو اک تسلی ہو — کلام کیجئے چاہے برا بھلا کہئے
جو نامہ آیا ہو کوئی حضور اسعد سے — سلام شوق بصد عجز و التجا کہئے
مری طرف سے دعاؤں کی التجا کیجئے — ہے منتظر نظر التفات کا کہئے

رواں ہوئی تو بھلا طبع نار سا خاور
کسی کی ایک خموشی نے کیا کیا کہئے

والسلام

عبداللہ خاور (از کراچی)

۱۹۵۲/۱۲/۱۲ء

جواب رومی

صدورِ نامۂ خاور نے جب شرف بخشا — تو اپنی آہ کو اب کیسے نارسا کہئے
لگائیے اسے آنکھوں سے دل پہ رکھ لیجئے — سرور دل کا اسے نور آنکھ کا کہئے
گزر جو آپ کا ہمدم ہو کوئے خاور میں — سلام ان سے میرا آپ ہی زرا کہئے
بلائیں لیجئے اور پوچھئے دعا دیکر — مزاج کیسا ہے عالی جناب کا کہئے
جو بار خاطر نازک نہ ہو تو پھر ان سے — وفور شوقِ تمنا کا ماجرا کہئے
مزاج یار مگر دیکھئے نہ برہم ہو — نہ کوئی بات خلاف رہ وفا کہئے
وہ میرے نام سے ممکن یہی ہے کہ برہم ہوں — برا نہ مانئے ان کو نہ کچھ زرا کہئے
ہزار طرح سے میرے قصور ہی گنئے — خطا بھی ہو کوئی ان کی تو بے خطا کہئے
وہ لاکھ بار جو روٹھیں منایئے انکو — غرض کہ جیسے بھی ممکن ہو مدعا کہئے
مرے جواب نہ لکھنے پہ آپ ہیں ناراض — یہ حق ہے آپ کا مانا اسے بجا کہئے
مگر کلام ہے اس میں کہ یہ بھی ممکن تھا — بغیر وجہ نہ لکھتا جواب کیا ؟ کہئے
جواب نامۂ منثور عرض کر دیتا — مگر سمجھ میں نہ آیا یہی کہ کیا کہئے
گزر رہی تھی جو اپنے پہ کہہ نہ سکتا تھا — نہ تھا گوارا کہ دنیا کا ماجرا کہئے
مگر اس آج کے خط نے تو کر دیا جادو — یہ بولا سر پہ مرے چڑھ کے اور کہا کہئے
جواب لکھنے پہ بے طرح کر دیا مجبور — اگر یہ سحر نہیں ہے تو اور کیا کہئے
میں لے کے ہاتھ میں کاغذ قلم تو بیٹھ گیا — مگر جو ہو نہ رسا فکر ہی تو کیا کہئے
کہ سنایئے اپنے وطن کے اب احوال — بس ایک ان کے نہ ہونے سے کیا ہوا کہئے
سوادِ ساحل جمنا تو بے سواد ہے اب — نسیم وادیٔ گنگا ہوئی ہوا کہئے
کہاں وہ صبح بنارس کہاں وہ شام اودھ — ہر ایک چیز کا نقشہ بدل گیا کہئے
جو کر کے ترک وطن چل دیئے کراچی آپ — تو کیوں کسی سے وہ غم ہائے جانگزا کہئے

یہاں کے وادی وساحل کا ذکر کیوں کیجئے　　اب آپ راوی و ستلج کا ماجرا کہئے
نکال دیجئے دل سے ہوائے یوپی اب　　ہے کیسی سندھ کی آب و ہوا بھلا کہئے
بھلا ہی دیجئے احباب ہند کو دل سے　　جو یاد آئے کوئی اس کو دور جا کہئے
اب آپ اپنے نئے دوست کیجئے پیدا　　انہی کو آپ بس اب اپنا آشنا کہئے
کسی کو آپ شریک حیات کر لیجئے　　اسی سے عہد گزشتہ کا ماجرا کہئے
نہ کچھ شکایت رنج گراں نشیں کیجئے　　نہ اب حکایت صبر گریز پا کہئے
سفینہ جب کہ کنارے پر آلگا اے دوست　　کسی سے کیا ستم و جور نا خدا کہئے
بھرا ہوا تھا مرا دل بھی کیسے نغموں سے　　یہ کس نے بربط دل چھیڑا اس کو کیا کہئے
دلِ شکستہ کی آواز گو کہ مدھم ہے　　بھرا ہے درد مگر حد سے بھی سوا کہئے
ہے فکر آپ کی جب نارسا تو ایسی ہے　　بھلا وہ فکر ہو کیسی جسے رسا کہئے
دعا پہ کیجئے اب ختم اپنی رومیؔ نظم　　ملیں گے پھر کبھی حافظ ہے گر خدا کہئے

عبدالقدوس رومیؔ حسن منزل الہ آباد

۱۹۵۲/۱۲/۲۲ء

تقسیم ہند کے بعد ایک ہنگامہ خیز جسارت

غالباً ۱۹۵۸ء کا زمانہ رہا ہوگا کہ حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کے کوئی شاگرد اُنہیں تلاش کرتے ہوئے میرے گھر پر آئے، میں اس وقت محلّہ صمد آباد (الہ آباد) میں رہتا تھا۔ جمعہ کا دن تھا نماز کیلئے جا رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا والد صاحب گورکھپور گئے ہوئے ہیں آپ کو ان سے کیا کام ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک بنگالی ہندو لڑکے لڑکی کو مسلمان کر کے ان کا نکاح پڑھانا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کام والد صاحب نہیں کریں گے، یہ کام میں کر سکتا ہوں چنانچہ وہ بنگالی (نتائی چند مکھرجی)

میرے پاس مدرسہ قرآنیہ میں آیا، اس سے بات ہوئی، اس نے کہا مجھے اسلام اور نکاح کا سرٹیفکٹ چاہئے۔ میں نے کہا کہ میں یہاں شہر قاضی تو نہیں ہوں کہ سرٹیفکٹ دوں، ہاں آپ مجھ سے رومن میں الگ الگ کاغذ پر دو سوال لکھ کر لائیں:

(۱) اسلام لانے کا کیا طریقہ ہے؟

(۲) اسلام میں نکاح کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

اور میرے بتائے ہوئے جواب کی روشنی میں کلمۂ شہادت کا اقرار کر کے مجھ سے اپنے مسلمان ہونے کے تصدیق کرا لیں، اسی طرح آپ دونوں دو مسلمانوں کی گواہی میں ایجاب وقبول کر لیں اور مجھ سے اپنے نکاح کی تصدیق کرا لیں۔ چنانچہ ان دونوں کو اس طرح مسلمان ہونے اور زوجین ہونے کی تصدیق کر دی گئی اور انہیں محلہ شاہ گنج میں کرایہ کا مکان دلوا دیا گیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے، لڑکی کے باپ نے اطلاع پاتے ہی پولس میں رپٹ درج کرا دی۔ اُس وقت الہ آباد کے اعلیٰ افسران اس طرح تھے:

ایس، پی، سٹی بنگالی، سول سرجن بنگالی، جج بنگالی، لہٰذا اس معاملہ میں پوری ہندو بنگالی قوم ایک ہوگئی۔ میں نے بشیر احمد ایڈوکیٹ سے رابطہ قائم کیا، وہ مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ بشیر صاحب نے پوری روداد سنی اور کاغذات دیکھے تو اس ترکیب کی داد دئے بغیر وہ بھی نہ رہ سکے، حیرت سے کہنے لگے مولانا! آپ تو پکچر میں کہیں ہیں ہی نہیں مگر اس قضیہ نے میرے ہمدردوں کو فکر مند کر دیا اور لوگوں نے والد صاحب کو سمجھایا کہ اب وہ ان کو یہاں سے ہٹا دیں ورنہ پولس والے انہیں کسی معاملہ میں پھانس دیں گے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ریاست کدورہ ضلع جالون کے گورنمنٹ اسکول میں اردو ٹیچر کی جگہ خالی تھی، ایک ڈپٹی ڈائریکٹر والد صاحب کے

شاگرد تھے اور اتفاق سے والد صاحب کے ایک ساتھی اسی کالج کے پرنسپل تھے۔ انہوں نے فوراً میرا عارضی تقرر وہاں کر لیا، چنانچہ ۱۹۵۸ء میں ریاست کدورہ پہنچ گیا، کچھ دنوں ایک مکان میں دوسرے ماسٹروں کے ساتھ رہنا ہوا۔ الہ آباد کے ماسٹر نذیر صاحب کا ساتھ اور دوستی وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں اُردو ٹیچر کی اس جگہ پر مستقل استاد کا تقرر ہو گیا تو مجھے وہاں سے ہٹنا پڑ گیا مگر کچھ دنوں کے بعد پھر وہ جگہ خالی ہو گئی تو پھر مجھے وہاں بلا لیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں اسی وجہ سے دوبارہ کدورہ چھوڑنا پڑا۔ وہاں سے اِٹاوہ جانا ہوا جہاں حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی فرمائش پر عم محترم حضرت صوفی صاحب کے ایما پر حاجی رئیس الدین صاحب کے یہاں کچھ عرصہ اتالیق رہا۔ اُن کے صاحبزادہ محمد احمد اور ناظم سلمہما نے مجھ سے پڑھا، اسی سال الہ آباد واپس آ گیا اور مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج میں اُردو دینیات وغیرہ پڑھانے لگا، تقریباً دو سال دولت حسین اسکول میں بھی اردو دینیات وغیرہ پڑھانے کیلئے مقرر کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج الہ آباد میں متعدد مرتبہ والد صاحب کی عدم موجودگی میں قائم مقامی بھی کی۔ آخر میں رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ مطابق نومبر ۱۹۷۰ء میں دار الافتاء جامع مسجد آگرہ میں مفتی شہر کی حیثیت سے آنا ہوا۔

راقم سطور اس وقت اپنی عمر طبعی کی حد پار کر چکا ہے جس کی وجہ سے قوت حافظہ دور شباب کے ساتھ ہی ساتھ رُخصت ہو چکی ہے، بعض اکابر ملت اسلامیہ کا تذکرہ اس سے پہلے سپرد قلم کیا جا چکا ہے۔ ذہن پر زور ڈال کر پچھلی یادوں کو اور کرید کر ان میں دبی چھپی مزید یادوں کی تلاش جاری ہے۔

قدیم ہندوستان جو حکمراں بندروں کی بندریت سے پہلے شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی ۱۵۰۰ میل طویل سڑک (جی، ٹی، روڈ) کے ہر دو طرف پھیلا ہوا آباد و

شاداب خطۂ زمین تھا۔ اِس خطۂ زمین پر متعدد بڑے بڑے شہر و قصبات اور چھوٹے بڑے مواضع اور مزرعے آباد تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسافروں کی سہولت کی خاطر سرائیں اور مسجدیں، تالاب اور کنویں موجود تھے۔

شہر الہ آباد جو صوبۂ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں سے ایک صوبہ آگرہ کی راجدھانی تھا، جب کہ دوسرے صوبۂ اودھ کی راجدھانی فیض آباد تھا۔ احقر اپنے وقت پیدائش ۱۹۲۳ء سے لیکر ۱۳۔۱۴ سال تک تو اپنے والدین ہی کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں بغرض تعلیم اپنے وطن سے قدم باہر نکالا تھا پھر بھی اُس وقت حضرت والد صاحب علیہ الرحمہ کا سایہ سر پر تھا، احقر کسی شمار و قطار میں نہ تھا۔ ۱۹۷۰ء میں جب کہ احقر کی عمر ۴۷ سال تھی، اللہ تعالیٰ نے اُسے مفتی شہر کی حیثیت سے شہزادی جہاں آراء کی جامع مسجد جہاں آراء میں قائم مدرسہ عالیہ کا صدر مدرس اور دار الافتاء کا مفتی شہر بنا کر الہ آباد سے اکبر آباد پہنچا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کی کچھ خاص دینی خدمت کے مواقع بھی فراہم کر دئے مثلاً اِسی زینہ سے وہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیسی رکنیت اور ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند کی بنیادی رکنیت، دار العلوم وقف دیوبند، مظاہر علوم وقف سہارنپور کی تاسیسی مجلس شوریٰ تک پہنچا۔ مدرسہ تعلیم القرآن وزیر پورہ، مدرسہ افضل العلوم تاج گنج، مدرسہ شمس المدارس شمس آباد، دار العلوم اوریا وغیرہ متعدد مدارس سے وابستگی کے مواقع حاصل ہوئے۔ فللّٰہ الحمد والشکر

کچھ عزیزوں کے یادوں کے چراغ جو اس وقت روشن ہو چکے ہیں

الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گمنام بندہ کو اپنے لطف و کرم خاص کے تحت اپنے خاندان کا سب سے طویل العمر سرپرست کے انداز میں رہنے کا موقعہ عنایت فرمایا ہے۔ یادوں کے چراغ نامی یہ تذکرہ شروع تو اسی طور پر کیا گیا تھا کہ اس میں صرف اپنے بزرگ، عزیزوں یا دینی بزرگوں کا ہی ذکر کیا جائے گا لیکن دل میں جب اپنے زمانۂ ماضی کو یاد کرنا شروع کیا تو بہت سے چھوٹے بھی اسی طرح ایڑیوں پر کھڑے ہو کر بڑوں کے برابر آنے کی کوشش کرنے لگے، جس طرح جنگ بدر کے موقعہ پر شوقِ شہادت سے سرشار دو بچوں نے اپنے آپ کو جماعت مجاہدین میں شامل کرا لیا تھا۔

اب ان کی یہ خواہش بھی میرے دل میں زور پکڑ رہی ہے کہ اس تذکرہ میں کچھ چھوٹوں کی یادیں بھی ہو جائیں تو کم از کم اہل خاندان تو اس چراغ کی روشنی کچھ نہ کچھ ضرور ہی محسوس کر لیں گے۔

حضرت والد محترم و مرحوم مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری اور برادر محترم و مرحوم مولانا عبدالرحمٰن جامی علیہما الرحمہ کے تذکرے علیحدہ علیحدہ پہلے لکھ چکا ہوں یہاں انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے صدیق محترم مولانا صدیق احمد صاحب باندوی علیہ الرحمہ کا تذکرہ مستقل طور پر لکھا جا چکا ہے، وہ اس میں شامل نہ رہے گا جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے کہ احقر اس وقت اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مسن اور معمر ہے، اس وجہ سے ماشاء اللہ اس کے خردوں کی تعداد خرد نہیں ہے۔

احقر کے بھائی بہن مجموعی طور پر سات حیات رہے، چار بھائی اور تین بہنیں، بھائیوں میں ایک بڑے بھائی اور بہنوں میں سے ایک منجھلی بہن جنت جانے میں

مجھ سے سبقت کر چکے ہیں، اب اس وقت احقر سے چھوٹے دو بھائی ہیں۔ یعنی ابوالعلماء والمفتین حافظ عبدالعزیز سعدی سلّمہٗ، مقیم، کیمپیر گنج گورکھپور اور عزیزم مولوی حافظ عبدالعلیم عیسیٰ سلّمہٗ، امام و خطیب جامع مسجد فیروز آباد (جنہیں الہ آباد سے فیروز آباد جناب مرزا سعید بیگ صاحب نے میری ہی خواہش و فرمائش پر بلایا تھا) اور دو بہنیں موجود ہیں، ان میں سے بڑی بہن کے بیٹے و بیٹیاں دین و مذہب کی پابندی کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم و دائم رکھے، آمین۔

ہمارے منے چچا مرحوم

سب سے پہلے ہمارے بہت ہی شفیق و بے تکلف منے چچا مرحوم و مغفور اور ان کے خاص مصاحب اور ہمارے ماموں اور بہنوئی قدسی سلّمہٗ۔

صحیح طور پر معلوم نہیں ہے، اندازہ یہ ہے کہ منے چچا کی عمر مجھ سے تقریباً دس گیارہ سال زیادہ رہی ہوگی اور وہ ۱۹۱۲ء کے قریب دنیا میں آئے ہوں گے اور قدسی سلّمہٗ، رشتہ میں تو میرے ماموں تھے، (ہماری امی کے حقیقی چچازاد بھائی) لیکن عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔

منے چچا کے حالات سے اندازہ یہی ہوا کہ انہوں نے پڑھنے کے زمانہ کو بھی تفریح اور یار باشی میں ہی صرف کیا تھا۔ پتلے دبلے دراز قد آدمی تھے، اس کی وجہ سے والی بال کے اچھے کھلاڑی تھے، کسی نہ کسی طرح ہائی اسکول کر لیا تھا اور الہ آباد کے ایک ہائی اسکول میں اُردو ٹیچر ہو گئے تھے۔ بعد میں اینگلو بنگالی کالج میں ہو گئے اور وہیں سے ریٹائرڈ ہوئے، اُردو مڈل وغیرہ کے امتحان کے ممتحن بھی ہوئے تھے جسکی خاص وجہ یہ تھی کہ ہمارے بابا جان (والد صاحب کے بڑے بھائی مرحوم و مغفور انوار الحق

صاحبؒ) پروفیسر کرسچن کالج الہ آباد رسائی کے آدمی تھے، محکمۂ تعلیمات میں اچھا بلند مقام اور نام رکھتے تھے، ہائی اسکول انٹر میڈیٹ بورڈ کے ممبر بھی تھے جو اس وقت عزت کی بڑی علامت تھی۔

محترم انوار الحق صاحب کی شادی الہ آباد کے مشہور ڈاکٹر سیّد زاہد حسین صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور یہ ڈاکٹر زاہد حسین الہ آباد کے مشہور شاعر اکبر حسین اکبر کے بھانجے تھے، اس طرح ہم لوگوں کی رشتہ داری زرا چکر کاٹکر اکبر حسین اکبر شاعر سے بھی قائم ہو جاتی ہے۔ اکبر صاحب کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہو گیا تھا، ان کے انتقال کے دو سال بعد ۱۹۲۳ء میں میری پیدائش ہوئی تھی اس لئے میں انہیں دیکھ تو نہیں سکا لیکن ان کے عزیزوں سے رشتہ داری کی وجہ سے ان کا تذکرہ تو سنتا ہی رہتا تھا، ان کے بھانجے ڈاکٹر زاہد حسین کو میں نے اچھی طرح دیکھا ہے کہ اپنی تائی (بڑی اماں) کے گھر تو آنا جانا ہوتا ہی تھا۔

ہمارے ماموں اور بہنوئی رضوان اللہ قدسی اور منے چچا مرحوم میں بہت چھنتی تھی، دونوں شاعر تھے اور ہم مذاق بھی۔ جوانی کے زمانہ میں دونوں ہی جوان بنے رہے تھے، مگر جب بڑھاپے نے زور کیا تو دونوں نے ہٹ دھرمی نہیں دکھلائی اور خوشی خوشی بڑھاپے کو قبول کر لیا، منے چچا تو قرآن مجید کی تلاوت کا بھی معمول رکھتے تھے، آخر تو خود بھی اچھے قاری کے بیٹے تھے، قرآن شریف اچھا پڑھتے تھے، خوش آواز و خوش لہجہ بھی تھے۔ ہمارے والد مرحوم و محترم اپنی غزلیں کبھی کبھی ان سے پڑھوا کر محظوظ ہوتے تھے۔

کچھ چھوٹے چراغوں کی روشنی سے بھی چراغاں

عزیزم شیخ سعدی سلّمہٗ مسمّیٰ بہ عبدالعزیز عرف بابو میاں

اس وقت ان کا تذکرہ عزیزم معاویہ سلّمہٗ کی فرمائش پر لکھا جا رہا ہے۔
ان کے زمانۂ طفولیت میں (جب ان کی عمر تقریباً پانچ چھ سال کی رہی ہوگی)۔
ہمارے والد صاحب فتح پور میں تھے کہ حکیم الامت حضرت اشرف العلماء تھانوی نے علاج کی غرض سے کانپور کا سفر کیا تھا، والد صاحب نے اپنے ساتھ ہم دونوں بھائیوں کو بھی لے جانا چاہا، اس سفر میں سب سے دلچسپ یہ صورت حال رہی کہ والد صاحب نے ایک زمانہ تک تو انہیں یہ مشق کرا دی تھی کہ جب تم سے کوئی نام پوچھے تو بتاؤ ”شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی عرف بابو میاں“ چنانچہ یہ سبق انہیں بالکل ازبر ہو گیا تھا اب والد صاحب کو فکر ہوئی کہ حضرت حکیم الامت نے اگر ان سے نام پوچھا تو یہ یہی آموختہ سنا دیں گے اس لئے چاہا کہ یہ اپنا پرانا سبق بھول جائیں اور نیا سبق یاد کر لیں کہ ”خادم کو عبدالعزیز کہتے ہیں“ لیکن جو سبق دو تین سال تک روزانہ رٹایا گیا ہوا سے حضرت نیاز کی طرح صاف دل سے کیسے بھلایا جا سکتا تھا، یہ برابر وہی جواب دیتے ”شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی عرف بابو میاں“۔

خیر کانپور میں اس کی نوبت ہی نہ آئی، وہاں تو زائرین کا جم غفیر تھا، حضرت کو بچوں سے تفریح طبع کا موقع ہی کہاں تھا۔

جامی و رومی کی مناسبت سے ان کی عرفیت سعدی تو مولانا ظہور الحسن صاحب کسولویؒ نے تجویز کی تھی۔ عزیزم سعدی سلّمہٗ جو اپنے تعلیمی دور ہی میں تبادلوں کا شکار رہے تھے مجھ سے قریب رہنے کی وجہ سے عزیز قریب کا صحیح مصداق ہیں۔ انکے بچپن کے بعض لطیفے اور واقعات دماغ میں گردش کرتے ہی رہتے ہیں جو اس وقت زیر قلم

آنے کیلئے بچوں کی طرح مچل رہے ہیں تو لیجئے دو ایک ہی واقعے سن لیجئے۔

الہ آباد میں ہم لوگ ایک درگاہ اور مقبرہ کی مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے جہاں والد صاحب ان کے بعض احباب اور درگاہ کے سجادہ نشیں صاحب بھی نماز پڑھتے تھے، اس مسجد کے صحن سے ملا ہوا ایک درخت شریفہ کا بھی تھا جس میں شریفے لگے ہوئے تھے، عصر کی نماز کا وقت تھا، سعدی سلمہٗ بہت غور سے شریفوں کو دیکھ رہے تھے کہ ان شریفوں کا شاید یہاں کوئی قدرداں نہیں ہے کہ ایک صاحب نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ان سے کہا کہ کیا شریفوں کو چرانے کا ارادہ ہے؟ والد صاحب نے یہ سنکر مصرعہ کہہ دیا

شریف ہو تو شریفوں کو مت چراؤ تم

اور احقر نے اسی وقت یوں کہا

شریف ہو تو شریفوں کو گھر میں لاؤ تم

اب ناظرین آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کا مصرعہ کیسا ہے؟

ویسے یہ اسی طرح کی بات ہوگئی جیسے استاذ محترم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نے اپنے ایک شاگرد رشید مولوی عبید اللہ بلیاوی مرحوم سے فرمایا تھا کہ

دوستی اور کسی غرض کیلئے — یہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں

لائق شاگرد نے بے تکلف برجستہ عرض کیا

دوستی اور کسی غرض کے بغیر — یہ حماقت ہے دوستی ہی نہیں

سعدی سلمہٗ میرے زمانہ قیام لکھنؤ میں میرے ساتھ رہے جہاں مدرسہ فرقانیہ میں کچھ عرصہ پڑھا تھا، وہاں یہ ایک روز لکھنؤ کے چڑیا گھر گئے واپس آکر بڑی حیرت اور تعجب سے کہنے لگے کہ بھابی وہاں ایک بہت ہی بڑا الو دیکھا،

انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ (مزاحاً) ان سے پوچھا کہ کیا وہ تم سے بھی بڑا تھا۔ کہنے لگے نہیں ہم سے تو چھوٹا تھا، ان کا یہ جواب سنکر سب لوگ ہنسنے لگے پھر یہ اپنے جواب کو سمجھ کر خود بھی بہت ہنسے۔

شہر لکھنؤ نوابانِ اودھ کی سینکڑوں داستانیں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے دوسروں کو چند تاریخی عمارتوں کی سیر وتفریح کرا کے واپس کر دیتا ہے، لکھنؤ کو امیر مینائی نے جس نگاہ سے دیکھا تھا اس کا اندازہ ان کے صرف ایک ہی شعر سے لگایا جا سکتا ہے

کہاں ہوں گی بھلا ایسی ادائیں حور وغلماں میں — رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

توبہ توبہ، استغفر اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ

سعدی سلمہٗ کا زمانہ حفظ میں بہت وقت لگ گیا تھا اسلئے انکے سرپرست بھی بدلتے رہے اور مدرسہ واستاد بھی بدلتے رہے۔ حفظ قرآن کا تجربہ رکھنے والے واقف ہیں کہ حفظ ایک جگہ جم کر ہونا چاہئے، مدرسہ واستاد کی تبدیلی نقصاندہ ہوتی ہے، ہر استاد پھر سے پڑھاتا ہے اسی وجہ سے سعدی سلمہٗ کا خاصا وقت حفظ ہی کی نذر ہو گیا اور اس کے بعد ان کی تعلیم زیادہ نہ ہو سکی البتہ ضروریات دین کے ساتھ ساتھ ادیب اور منشی وغیرہ، اُردو، فارسی اور حساب کے امتحانات دے دئے پھر جب انہیں فتح پور تال نرجا (مئو) بھیجا گیا وہاں چچا میاں مولوی امجد اللہ صاحب گورکھپوری مہاجر مدنی" کی نظر انتخاب ان پر پڑ گئی اور انہوں نے اپنا داماد بنانے کے ساتھ ہی ساتھ کیمپیر گنج فارم کی نگرانی بھی ان سے متعلق کر دی جس کی وجہ سے یہ الہ آبادی سے گورکھپوری ہی ہو گئے اور کاشتکاری وباغبانی سے متعلق اچھی واقفیت اور خوب تجربہ رکھتے ہیں۔

عزیزی سعدی سلمہٗ نے ہمارے خاندانی عزیزوں کی دین کے تعلق سے

گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کرتے ہوئے اپنے سبھی بچوں کو نہ صرف حافظ بلکہ عالم و مفتی بنانے کی ہمت کر ڈالی اور اللہ تعالیٰ نے ''ہمت مرداں مددِ خدا'' کے تحت انہیں کامیاب کر دیا اور اللہ تعالیٰ نظر بد سے محفوظ رکھے، ماشاء اللہ وہ اس وقت خود تو ابوالعلماء ہی ہیں لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بعد بھی یہ سلسلہ مزید ترقی کریگا، خدا کرے ایسا ہی ہو، آمین۔ سعدی سلمہٗ نے ہمت کر کے اپنے ایک بیٹے کا نام معاویہ رکھ دیا ہے، مجھے ان کے اس اقدام سے بہت خوشی ہوئی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ عزیزم معاویہ کو بھی یہ ہمت مرحمت فرما دیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کو خوش رکھنے کی نیت سے اپنے بیٹے کو بھی امیر یزیدؒ بن معاویہؓ کا ہم نام بنالیں۔

امیر یزیدؒ کی ساری بدنامی مکار روافض کی فرضی اور بے بنیاد کربلا کی ان داستانوں کے تحت رواج پا گئی ہیں جنہیں انہیں اپنی مکاری اور سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو دھوکہ اور مغالطہ میں مبتلا رکھ کر شہید کرانے کیلئے منصوبہ بند طور پر انجام دیا گیا تھا۔ ''ماتم حسین'' کے نام پر شہادت ناموں کے نام سے بازاروں میں پھیلا دیا گیا ہے جن کا حقیقت سے تعلق تلاش کرنا بھی مشکل کام ہے۔ یہ بات حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کے رسالہ ''قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی'' میں پوری تحقیق کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

پہلے شیخ سعدی شیرازیؒ نے ''گلستاں، بوستاں'' نامی کتابیں لکھ کر علمی دنیا میں باغبانی کا کام انجام دیا تھا، یہ ہمارے سعدی سلمہٗ جوان کے سمی و ثنی ہوئے تو انہوں نے مجاز و استعارہ کی راہ چھوڑ کر حقیقت کی راہ اختیار کر لی اور کیمپیر گنج کے جنگل میں واقعی گلستاں، بوستاں کی بہاریں دکھا دیں۔ اللہ تعالیٰ صحت و عافیت دارین عطا فرمائے۔ آمین

عزیزم مفتی زین الاسلام سلّمہٗ

نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

عزیزم مفتی زین الاسلام سلّمہٗ احقر کے ہمشیرزادہ اور برادرِ محترم مولانا جامی علیہ الرحمہ کے خویش بھی ہیں اور ان سے تعلیمی زندگی میں انہیں استفادہ کا بھی موقع ملا ہے، اس کے بعد یہ برادرِ عزیزم مولانا قمر الزماں صاحب اعظمی زید مجدہم سے وابستہ ہو گئے اور انہیں کے مدرسہ میں مدرس بھی۔ سلوک و تصوف میں ماضی قریب کے مشہور مرشد حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڑھیؒ سے مراحل سلوک طے کئے۔ احقر کے ساتھ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے بعض جلسوں میں بھی شرکت کرتے رہے ہیں، مجھ سے ''سراج الاسلاف لاخلاف السراج'' لکھنے کی فرمائش انہی نے کی تھی۔ باحوصلہ نوجوان ہیں ابھی ماضی قریب میں رویت ہلال کے پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے مسئلہ سے متعلق ایک رسالہ ''ما یحضرہ المفتی'' کے نام سے لکھ دیا ہے۔ رسالہ کا نام ان کی عربیت کی غمازی ضرور کر رہا ہے لیکن رسالہ اُردو زبان ہی میں ہے، اردو داں حضرات بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس موقعہ پر یہ بات صاف ہو جانی چاہئے کہ رویت ہلال کا معاملہ عام طور پر جذباتی معاملہ بن جاتا ہے، اس وقت اصل ذمہ داری اس شہر کے قاضی و مفتی کی ہوتی ہے، وہ جس ذہن وخیال کا ہوگا اسی کے مطابق فیصلہ کرے گا، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو مزید علمی کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

الہ آباد کے ایک مخلص و محب پڑوسی

برادرم زاہد علی مرحوم مقیم صمد آباد

الہ آباد میں احقر کا قیام مختلف ادوار میں تقسیم ہے، بچپن میں آٹھ دس سال گزرنے کے بعد حضرت والد صاحب کے تبادلوں کی وجہ سے فتح پور، فتح گڑھ، کانپور میں رہ کر اور پھر ۱۹۴۴ء میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۴۵ء میں الہ آباد، ۱۹۴۶ء میں مراد آباد اور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء لکھنؤ میں رہنا ہوا تھا پھر ڈابھیل کی ملازمت کے بعد ۱۹۵۰ء میں الہ آباد آ گیا تھا۔ الہ آباد کا یہ زمانۂ قیام تقریباً دس سال رہا ہوگا اور ابوالقلم ہونے کی وجہ سے یہ دور کچھ ہنگامہ خیز بھی رہا تھا۔ تقریباً دس سال تک ہنگامہ خیزی کے بعد ۱۹۶۰ء میں ریاست کدورہ باونی اسٹیٹ ضلع جالون کے گورنمنٹ اسکول میں معلم رہا۔

الہ آباد کے زمانۂ قیام میں جن ہنگامہ خیزیوں کا اُوپر ذکر ہوا ہے اس سارے دور میں برادرِ مرحوم زاہد علی نے ناقابل فراموش، بلکہ قابل یادگار طور پر احقر کے ساتھ مالی اور جانی تعاون سے بھی گریز نہیں کیا تھا، اس وجہ سے وہ بجا طور پر اس کے مستحق تھے کہ یادوں کے اس چراغ میں ان کا ذکر خیر کیا جائے۔

محب مخلص زاہد علی مرحوم کے تذکرہ کو طول نہ دیتے ہوئے اپنی ہنگامہ خیزی اور ان کی حمایت وتعاون کی ایک مثال تو یہاں محفوظ ہو جائے جس سے ناظرین کو بھی کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ زاہد صاحب میرے کیسے سچے اور پکے دوست تھے، ایسے دوست خال خال ہی ہوا کرتے ہیں۔

اُوپر احقر نے اپنی ہنگامہ خیزی کا ذکر صرف عنوان ہی کے طور پر کیا ہے، اب اس کی ایک مثال بھی ملاحظہ فرمائی جائے۔

الہ آباد میں راقم حروف ایک مقامی اور محلہ ہی کے مدرسہ (قرآنیہ) میں چھ سال تک مدرّس دوم اور اخیر کے دو سال مدرّس اوّل رہا تھا، مدرسہ کی ایک رجسٹرڈ کمیٹی بھی تھی جس میں ایک صدر صاحب تھے اور احقر کے مالک مکان خزانچی اور مدرسہ کے مہتمم صاحب صدر صاحب کے داماد تھے۔ ایک زمانہ میں شہر میں انفلوئنزا پھیلا ہوا تھا، سرکاری حکم آیا کہ مدرسہ بند کر دیا جائے، مدرسہ کے سکریٹری بنگالی کالج کے ایک پروفیسر صاحب تھے، میں نے ان سے دریافت کیا، انہوں نے مدرسہ بند کرنے کی اجازت دے دی، میں نے مدرسہ بند کر دیا، صدر صاحب جو اس مزاج کے نہ تھے انہیں مدرسہ کا بند ہونا ناگوار ہو گیا اور پھر خزانچی صاحب نے اس بات پر ناراض ہو کر کہ میں ان کے ایک مقدمہ میں جھوٹی شہادت دینے کیلئے تیار نہ ہوا تھا۔ ان حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے اس پرانے ابوالقلم نے ''شوفی کا ایکسرے'' کے عنوان سے ایک اشتہار مرتب کر کے شائع کر دیا۔ شوفی کے اشارے سے یہ چار ارکانِ مدرسہ مراد لئے گئے تھے، بانی مدرسہ، صدر کمیٹی اور ان کے معاون بڑے بھائی اور مدرسہ کے خازن۔

خزانچی صاحب نے اشتہار پڑھ کر ہتکِ عزت کا مقدمہ میرے خلاف دائر کر دیا کیونکہ انہیں شہر میں بڑی عزت حاصل تھی اور دولتمند بھی تھے (جو ناجائز طور پر انہیں اپنی خوش دامن کے انتقال پر ہاتھ لگ گئی تھی) مقدمہ دائر ہو گیا اور آٹھ مہینے تک تاریخیں پڑتی رہیں اور زاہد صاحب مرحوم میرے ساتھ کچہری کا چکر لگاتے رہے مگر زیادہ پُرلطف تو اس مقدمہ کا نتیجہ رہا کہ آٹھ مہینے کی طویل مدت گزرنے پر بھی انکے وکیل کو اور نہ عدالت کے جج اور منصف کو ابوالقلم کے مرتب کردہ اشتہار میں کوئی قابل گرفت اور مصداقِ جرم جملہ ہی نہ مل سکا اور چارج فریم ہوئے بغیر ہی مقدمہ خارج ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ احقر کا سارا اشتہار مزاح اور مذاق کے انداز میں لکھا گیا تھا، اسے پڑھ کر

شائد عدالت کو بھی ہنسی ہی آئی ہوگی اور یہ ہنسی کچھ تو اشتہار کے مضمون پر رہی ہوگی اور کچھ ان مقدمہ باز مدعیوں کی بے وقوفی پر رہی ہوگی کہ بلا وجہ انہوں نے عدالت کو بھی اس اشتہار سے محظوظ ہونے کا موقع دیا۔

زاہد صاحب آٹھ مہینے تک اپنے پیسے خرچ کر کے مجھے عدالت لے جاتے اور ان سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی وہاں کافی تھے اور احقر بھی شہر کا گمنام شہری نہ تھا

دوستوں کو یاد رکھتا ہوں اس طرح دل کو شاد رکھتا ہوں

ان سب کی یاد آتی ہے ہر گھڑی یادِ حق دلاتی ہے

برادرم محرم علی صاحب اور برادرم ضیاء الاسلام عثمانی

ابھی قلم یہیں تک پہنچا تھا کہ الہ آباد کی روشنائی سازی سے متعلق میرے قدیم دوست و قدرداں حاجی رمضان علی اینڈ سنس کے موجودہ جانشین برادرم محرم علی کا فون الہ آباد سے آ گیا اور انہوں نے بڑے پُر تپاک انداز میں الہ آباد کے سفر کی فرمائش کر دی۔ انہوں نے کہا کہ یہاں کے لوگ آپ کو برابر یاد کرتے رہتے ہیں، عرصہ سے آپ کی کوئی خیر خبر نہیں مل سکی ہے۔

الہ آباد میں کچھ لکھنے لکھانے کی مشق برادرم ضیاء الاسلام عثمانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہوئی تھی، محرم صاحب اور ضیاء صاحب بہت گہرے دوست تھے۔ ضیاء صاحب کچھ ادبی کتابیں بڑے اہتمام سے چھپواتے اور فروخت کرتے تھے، انہوں نے لکھنے لکھانے کیلئے کچھ جز وقتی طور پر مجھ سے بھی کام لیا تھا جس زمانہ میں احقر اسلامیہ کالج اور دولت حسین میں پڑھاتا تھا۔ وہ کتابوں کو اعلیٰ پیمانہ پر شائع کرنے کا ذوق رکھتے تھے، کچھ دنوں تک ''فسانہ'' نامی ایک رسالہ نکالتے تھے جس میں ہمارے خاندان کا ایک تاریخی واقعہ جسے ابا میاں مرحوم نے ''پاداشِ وفا'' کے

عنوان سے لکھا تھا۔ واقعہ کا پلاٹ انہیں بھی پسند تھا مگر انہوں نے اپنے جدید اور نامفہوم ذوق کی وجہ سے اس کا عنوان ''مچھلیاں'' کر دیا تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت ہمارے اہل خاندان نے ایک انگریز کو پناہ دیکر مارے جانے سے بچا لیا تھا، ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد ہمارے والد کی دادی کے حقیقی بھائی غدر کی شرکت کے شبہ میں گرفتار ہو گئے اور ان کیلئے پھانسی کا حکم جاری ہو گیا۔ انہیں پھانسی دیکر ان کی نعش دریا برد کر دی گئی تھی، اس واقعہ کی وجہ سے دادی صاحبہ نے دریا کی مچھلیاں کھانا چھوڑ دی تھیں، کہ شاید ان مچھلیوں نے ہمارے بھائی کو کھایا ہوگا اس لئے میں یہ مچھلیاں کیسے کھا سکتی ہوں۔

اس واقعہ کو ضیاء صاحب نے ''مچھلیاں'' کا عنوان دیکر شائع کیا تھا۔

بار بار محرم صاحب کا فون آ رہا ہے اور طبیعت بٹ رہی ہے، جو کچھ لکھ رہا ہوں اس میں برجستگی کا انداز نہیں آ رہا ہے، نہ آئے برجستگی کا انداز تو یہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، پڑھنے والے اس سے شاید اندازہ تو لگا ہی لیں گے کہ لکھنے والے کا جسم چاہے آگرہ میں ہو یا اس سے بھی دور سہارنپور میں ہو لیکن اس کے دل سے اس کے وطن پیدائش کی اور اہل وطن محبت والوں کی یاد تو اس کے دل کی گہرائی میں بیٹھی ہوئی ہے وہ کیسے نکل سکتی ہے۔ محرم صاحب الہ آباد بلانا چاہتے ہیں اور میں بھی اس وقت پر تولنے میں لگا ہوا ہوں، لنگڑا اور چلنے پھرنے سے معذور نہ ہوتا تو اب تک کتنے چکر الہ آباد کے لگ سکتے تھے مگر اب تو معاملہ یہ ہے کہ ''دست بدستے دگرے پابہ دستے دگرے'' کوئی بلانا چاہے تو میں خوشی خوشی اپنے کو گرفتار کرا دوں گا، بھاگنے کی مطلق کوشش نہ کروں گا اور گرفتاری کے وقت یہ شعر پڑھتے ہوئے گرفتاری دی جائے گی

آپ اُڑ کر آئے ہیں دانستہ ہم تو دام میں کھینچ کر لائی نہ تھی کچھ آب و دانہ کی ہوس

الہ آباد سے میرا دلی تعلق ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ وہ میرا وطن مالوف ہے، وہاں میری زندگی کے بہت سے دور گزرے ہیں، وہاں میں نے اپنی کتنی ہی یادگاریں چھوڑی ہیں جن کی یاد کیساتھ ساتھ وہاں کے احباب بھی مجھے یاد کرتے رہتے ہیں۔

الہ آباد کے مشہور بیرسٹر جناب بشیر الدین احمد صاحب مرحوم

ان کا سیدھا سا اور آسان تعارف اس طور پر زیادہ بہتر ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ و متفقہ تنظیم مسلم پرسنل لاء بورڈ جو آج سے تقریباً پینتیس چالیس پہلے قائم ہوئی تھی یہ بشیر الدین صاحب گویا اس کے روحِ رواں بانی اور فاؤنڈر تھے جنہوں نے دار العلوم دیوبند جاکر حضرت فخر الاماثل حکیم الاسلام علوم قاسمی کے اصلی وارث قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کو اس کا اوّلین صدر بنا کر اور کرسیِ صدارت پر بٹھا کر مسلم پرسنل لاء بورڈ کی پہلی میٹنگ بمبئی میں کر کے ایک بے مثال کنونشن اور یادگار کارنامہ انجام دیا تھا لیکن راقم کی حقیقت نگاری اس حقیقت کو زیرِ پردہ رکھنے کیلئے تیار نہیں ہے کہ نام ونمود کے علمبردار حضرات نے اس گمنام مگر مخلص و بے لوث شخصیت کو محض اپنے تحزب بیجا کی بھینٹ چڑھا دیا کہ وہ بیچارہ ایک انگریزی داں قانون داں مخلص مسلمان تھا مگر اس کے پاس دار العلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور یا ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ رحمانیہ مونگیر وغیرہ کی دستارِ فضیلت اور سندِ افتخار نہیں تھی تاہم وہ جس لائن سے آئے تھے اسے دیکھتے ہوئے قابلِ قدر ضرور تھے، ان کی اہلیہ سلمہا نے الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم کے دور میں والد صاحب سے عربی پڑھی تھی اور خود جناب بشیر صاحب نے الہ آباد یونیورسٹی سے قانون کا امتحان دیکر اس میں ٹاپ کیا تھا، وہ کسی مقصد سے ہمارے گھر آئے تھے تو والد صاحب نے مجھے متوجہ کر کے بتایا تھا کہ انہوں نے قانون کے امتحان میں ٹاپ کیا

ہے۔ ایک معاملہ میں احقر کو کچہری عدالت کی کچھ نوبت آگئی تھی تو میری کارروائی کے کاغذات کو دیکھ کر انہیں کہنا پڑا تھا کہ مولانا آپ نے تو اپنے علم و ذہن سے ماشاء اللہ خوب کام لیا ہے آپ اس پورے معاملہ میں قانوناً کہیں بھی پکچر میں نہیں آئے ہیں اور وہ معاملہ دو غیر مسلموں کے مسلمان ہونے اور ان کی باہم شادی کا معاملہ تھا اور زمانہ تقسیم ہند کا تھا جس وقت اس قسم کے اقدام کو کسی مسلمان کیلئے سوچنا بھی مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندہ سے یہ کام لے لیا اور وہ ہر طرح سے محفوظ ہی رہا۔ پولس والوں نے بھی یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ مولانا آپ نے بھی کمال کردیا، یہ زمانہ کسی کو مسلمان کرنے کا کہاں ہے؟ تو احقر نے انہیں یہ جواب دیا کہ جناب ٹھاکر صاحب آپ کی ہمدردی کا شکریہ مگر میں نے یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کیلئے کیا ہے اور اس پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ مجھ سے اس معاملہ میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ یہ سن کر بولے کہ آپ نے بھگوان کیلئے کیا تو بھگوان نے آپ کو بچا بھی لیا۔ سچ کہا گیا ہے کہ "ہمت مرداں مدد خدا" اللہ کی مدد سب پر غالب ہی رہتی ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے بہت خوب کہا ہے ۔

جھکتا نہیں بندہ کسی بدخواہ کے آگے — کیا غم ہے توکلت علی اللہ کے آگے

اس موقع پر ایک مسلمان کانگریسی لیڈر اور بے باک مقرر شاہد فاخری صاحب کا بھی تذکرہ ہوجائے کہ اس معاملہ میں پولس کے درمیان آجانے کی وجہ سے کچھ فکر و تشویش تو طبعی طور پر ہونی ہی چاہئے تھی مگر بفضلہ تعالیٰ وہ احقر کو تو نہ تھی لیکن بھی رشتہ دار اور عزیز ضرور متفکر تھے۔ اس موقع پر ان مجاہد آزادی صاحب کے پاس جانا ہوا تو انہوں نے نہایت ہمدردانہ انداز میں فرمایا بیٹا! تم نے بھی کمال کردیا ارے یہ زمانہ کسی کو مسلمان کرنے کا ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے احقر کی پوری حفاظت فرمائی پھر بھی والد صاحب کے احباب نے والد صاحب سے کہا کہ یہ پولس کی نظر میں آگئے

ہیں وہ کسی وقت بھی انہیں کسی دوسرے معاملہ میں اُلجھا کر اور مجرم بنا کر کارروائی کر سکتی ہے اس لئے اس وقت ان کو الہ آباد سے ہٹا دینا ہی مناسب ہے چنانچہ مجھے ریاست کدورہ گورنمنٹ اسکول کی ملازمت پر روانہ کر دیا گیا۔ الہ آباد میں نہایت پُر آشوب اور خطرناک زمانہ میں غیر مسلم کو مسلمان کر لینے سے میری ہمت بڑھ گئی تھی جو آگرہ آکر مزید ترقی پذیر ہوئی اور یہاں تو دارالافتاء جامع مسجد کے پرانے ریکارڈ میں نومسلموں کو اسلام کی سند دینے کا بھی ایک رجسٹر تھا جو پہلے کی پرانی دستاویزی اور عدالتی زبان میں تھا احقر نے اسے ازسرِ نو مرتب کر کے چھپوایا اور بفضلہٖ تعالیٰ اب تک ایسے نومسلموں کی تعداد تقریباً سوا سو ہو چکی ہے جن میں مرد و عورت، جوان اور بوڑھے سبھی شامل ہیں۔ الحمدلله الذی هدانا لهذا وما کنا لنهتدی لو لا ان هدانا الله۔ الآیة

ایک دوسرے ایڈوکیٹ جناب شمس الدین صاحب

یہ الہ آباد کے مقدمات فوجداری کے چند اچھے وکیلوں میں سے ایک تھے، راقم کے بھانجے عزیزم ضیاء الاسلام سلمہٗ کے علاتی بھائی قمر الاسلام نے وکالت کی تربیت انہیں سے پائی تھی، ''شوفی کا ایکسرے'' نامی جو اشتہار تھا اس کی مقدمہ بازی میں یہی وکالت کرتے تھے (یا قمر الاسلام دیکھ لیتے تھے)۔ انکی بیوی کراسویٹ گرلز کالج میں اُردو فارسی پڑھاتی تھیں، انہیں کے ذریعہ فارسی کا پہلا ٹیوشن پڑھایا تھا، یہ لوگ منے چچا کے سمدھیانے والے شیعوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان میں باراتیوں میں سے تھے جو عزیزہ حافظہ سلمہا کی بارات سے لوٹا دیے گئے تھے۔ میری فارسی تعلیم بس یوں ہی واجبی سی تھی، اس کو پڑھانے کے زمانہ میں اسے چاہے فارسی آئی ہو یا نہ آئی ہو مجھے تو آ ہی گئی، وہ ذہین اور تیز تھی،

اسے یوں ہی پڑھایا نہیں جا سکتا تھا۔

شمس الدین صاحب اور میرے بہنوئی اور عبدالصمد تحصیل دار صاحب کے پرانے تعلقات تھے، اس وجہ سے وہ اس تعلق کو بنیاد بنا کر عبدالصمد صاحب کے بھائی بکر مجھ سے بھی پُر مذاق انداز میں کبھی کبھی باتیں کر کے لطف اندوز ہوا کرتے تھے، آدمی نمازی تھے، عدالت میں بحث کے دوران بے جھجک نماز پڑھنے چلے جایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

دو تین خطاط بھی اس وقت یاد آ گئے

جن میں ایک جو اچھے اور مشہور خطاط رضا حسین تھے اور خدا جانے کیسے ابامیاں کے پسندیدہ خطاط تھے، میرا یہ تعجب سمجھنے کیلئے یہ واقعہ پڑھ لیں۔ الہ آباد کے بنگالی کالج میں ایک شیعہ لڑکا فارسی پڑھتا تھا اور میرا مشغلہ بڑی حد تک ٹیوشن پڑھانا ہی تھا، ایک روز اس نے کہا میں نے بی، اے میں فارسی لے رکھی ہے، آپ مجھے پڑھا دیا کریں، میں نے جواب دیا کہ میں تو زیادہ تر عربی پڑھاتا ہوں بی، اے کی فارسی ابھی تک پڑھائی نہیں ہے، تم والد صاحب سے پڑھ لیا کرو، وہ والد صاحب سے ملا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد ایک روز والد صاحب نے اس سے پوچھ لیا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جائس، کہنے لگے وہی جائس جہاں کے رافضی مشہور ہیں اس نے کہاں، جی ہاں! وہی جائس اور میں خود بھی وہی ہوں۔ والد صاحب نے پھر تصدیق کی، اچھا اگر تم رافضی ہو تو میں تم کو نہیں پڑھا سکتا یہ کہہ کر اسے کتاب واپس کر دی۔ منے چچا بھی اس محلہ میں رہتے تھے وہ والد صاحب کے انداز سے متاثر ہو کر رو دیا اور روتے ہوئے یہ واقعہ منے چچا کو سنایا، انہی سے مجھ کو یہ صورت حال معلوم ہوئی اور میں نے بھی دل میں افسوس کیا کہ میں نے اسے وہاں کہاں بھیج دیا تھا۔

آگرہ اور الہ آباد کے علاوہ چند مقامات سکونت کا مختصر تذکرہ

الہ آباد تو احقر کا وطن اصلی ہے ہی لیکن اکبر آباد آگرہ بھی وطن اقامت بن ہی چکا ہے کہ احقر یہاں اڑتیس سال سے مسلسل قیام پذیر ہے، جب کہ الہ آباد میں جو قیام رہا جو وہ زیادہ عرصہ تک مسلسل نہ رہ سکا، ان دو شہروں کے علاوہ چند مقامات ایسے ہیں جہاں کا زمانہ قیام اور وہاں کے مخلصین و محبین، اہل تعلق اصحاب اب تک برابر یاد آتے رہتے ہیں حالانکہ وہاں سے ترک سکونت کئے ہوئے طویل مدت گزر چکی ہے۔

ان مقامات کے نام پہلے پڑھیں، اس کے بعد آگے بڑھیں۔ وہ مقامات یہ ہیں : کدورہ، باونی اسٹیٹ ضلع جالون (ڈویژن جھانسی صوبہ یوپی) اٹاوہ۔

احقر الہ آباد میں تھا اور کسی ایک جگہ پر مستقل طور پر قیام نہ تھا کہ ہمارے والد صاحب کے ایک دوست نورالحسن صاحب جو گورنمنٹ کالج میں انکے ساتھ تھے وہ کدورہ کے گورنمنٹ اسکول کے پرنسپل ہو گئے تھے، کدورہ کے اسکول میں اُردو پڑھانے والے استاذ کی جگہ خالی تھی، اُنہوں نے مجھ سے درخواست لکھوا کر دفتر سے میرا تقرر کرا دیا۔

اور پھر میں ۱۹۵۸ء میں تن تنہا کدورہ پہنچ گیا اور پوچھتے پاچھتے پرنسپل صاحب کے مکان پر پہنچ گیا، موصوف کا مکان بس اسٹینڈ سے قریب ہی تھا، اُنہوں نے بہت تپاک سے خیر مقدم کیا، اس وقت تک وہ بھی اپنے مکان میں تنہا رہتے تھے، ان کے پاس اسکول کا چپراسی خدمت کیلئے رہتا تھا۔ کچھ دنوں ان کے ساتھ رہنے کے بعد ماسٹر رضوی صاحب اور ماسٹر نذیر صاحب کے ساتھ ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا اور وہیں ایک شریف و غریب گھر میں کھانا پکنے کا نظم ہو گیا۔ کدورہ کا قیام ۱۹۵۸ء سے لیکر ۱۹۶۳ء تک رہا تھا۔

کدورہ میں احقر کے چند مخلص محبین کے ناموں کی صراحت ہو ہی جانی

چاہئے: مولوی حفیظ اللہ صاحب، ماسٹر صدیق صاحب، حافظ عبدالمجید صاحب، محمد حسین حزیں، نواب مشتاق الحسن والی ریاست کدورہ، باونی اسٹیٹ اور ان کے بعض اعزہ بدر عالم صاحب، انکے صاحبزادگان وحید عالم، صفدر عالم، حیدر عالم اور داماد ڈاکٹر خواجہ نفیس الحسن مرحوم۔

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے قریبی رشتہ دار، ہم زلف ڈپٹی علی سجاد صاحب بھی وہیں کے رہنے والے تھے جن کے داماد ڈاکٹر عبدالحئی صاحب علیہ الرحمہ تھے، انکی ولادت بھی کدورہ ہی میں ہوئی تھی جن کی سیرت کی کتاب اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیرت کی کتابوں میں بہت مشہور ہوئی جسے آگرہ کے شہیر تاجر اور گمنام صاحب خیر نے بھی مدرسہ افضل العلوم کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں نہایت اہتمام سے شائع کیا اور کتنے ہی لوگوں کو بغیر قیمت مفت ہی فراہم کی جس کا ایک زندہ گواہ یہ راقم بھی ہے اور وہ اپنی عمر کے لحاظ سے اس قابل ہو چکا ہے کہ اسکی شہادت کو اس معاملہ میں آپ دوہری شہادت کی حیثیت سے قابل قبول مان لیں۔

نواب صاحب کی کوٹھی میں مسجد تھی اور جس اسکول سے میرا تعلق تھا وہ کوٹھی کے بالکل ہی سامنے تھا، ظہر کی نماز پڑھنے اسی مسجد میں جاتا تھا، کوٹھی سے نواب صاحب روزانہ دیکھتے تھے، ایک روز فقیرے نامی اپنے ملازم کو بھیج کر مجھے یاد فرمالیا، تعارف میں نام کے ساتھ رومی سن کر میری شاعری کا اندازہ کرلیا۔ ان کے گھر میں ایک قوال بھی براجمان تھا، بندو نام تھا وہ بھی شاعری کرتا تھا، بیگم صاحبہ ریاست مالیر کوٹلہ کی رہنے والی تھیں اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھی تھیں۔ اب باقاعدہ ان کی کوٹھی (جس کا نام بیگم صاحبہ کے نام شوکت جہاں کی وجہ سے شوکت منزل تھا) میں طرحی مشاعرے ہونے لگے اور وہیں میں باقاعدہ شاعر بن گیا، ٹونک سے بھی ان کا تعلق تھا وہاں سے بھی بعض شعراء آتے تھے۔

کدورہ جا کر وہاں کے پرانے لوگوں سے ریاست کے پرانے حالات اور موجودہ بیگم صاحبہ کی شاہ خرچیوں کے قصے سنے، معلوم ہوا کہ ریاستوں پر وزیر داخلہ شیطان پٹیل کی جو نوازشیں اور مہربانیاں ہوئیں ان کی داستانیں سنیں، معلوم ہوا کہ ریاست کے ختم ہونے سے پہلے نواب صاحب کی کوٹھی میں سولہ کاریں تھیں لیکن ۱۹۵۸ء میں جب میرا جانا ہوا ہے تو ان کے قبضہ میں شاید ہوئی ٹھیلہ یا چھکڑا بھی نہ تھا مگر رسّی جل جانے کے باوجود بل باقی تھے اور بیگم صاحبہ اپنا پریوی پرس لینے پوری بس کرایہ پر لیکر لکھنؤ آتی جاتی تھیں۔

گورنمنٹ اسکول میں بریلی سے ایک پرنسپل رام کرشن شرما نامی، اُردو سے اچھی طرح واقف تھے، اُردو پڑھ بھی لیتے تھے اور بہت اچھی اُردو بولتے بھی تھے، اُنہوں نے میرے نام کے ساتھ رومؔی سنکر میرے شاعر ہونے کا اندازہ کرلیا۔ کدورہ کی صورتحال آتے ہی دیکھ چکے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ کوئی بھی شاعر اس بستی کو دیکھنے سمجھنے کے بعد کچھ نہ کچھ شاعری کرنے پر مجبور ضرور ہو جائے گا، اس لئے مجھ سے سوال کر ہی بیٹھے کہ کہیئے:

”رومی صاحب! آپ نے کدورہ سے متعلق کوئی قصیدہ کہا ہے؟“

میں نے انکو جواب تو یہی دیدیا کہ ابھی تک تو نہیں کہا ہے...... لیکن اتنے دنوں میں کدورہ سے واقفیت کچھ تو ہو ہی گئی تھی، اس لئے ان کا سوال محرک بن گیا اور میں نے ”تصویر کدورہ“ کے عنوان سے مثنوی کے طرز پر اُردو میں ایک مثنوی لکھ ہی ڈالی جس کے چند شعر ناظرین بھی پڑھ سکتے ہیں۔

جناب نے جو کدورہ کا حال پوچھا ہے — جواب سخت ہے مشکل سوال پوچھا ہے
کدورہ کیا ہے کدورت کا ایک خزانہ ہے — اور ایسا کوردہ ہے گویا کہ جیل خانہ ہے
پتہ نہیں یہ ریاست کے جیل خانے تھے — یا ہاتھی رہتے تھے اُن میں یہ فیل خانے تھے

فیل خانے اگر تھے تو اُن کے دروازے — سمائی ہاتھی کی کیسے رکھتے تھے
تو پھر ضرور یہاں کے مکاں تھے جیل کبھی — وہ قیدی رہتے نہ ہوتی جن کی بیل کبھی
ذرا ذرا سے ملیں گے مکاں کے دروزے — کہ جن میں بے جھکے بونا بھی کوئی جانہ سکے
نہیں ہیں کمرے اُنہیں کال کوٹھری کہیئے — جلائیں آپ جہاں دوپہر میں چار دیئے
سنا نہ تھا کہیں ہوتا ہے گرد کا دریا — مگر اُسے یہاں آنکھوں سے اپنی دیکھ لیا
کسی سڑک کو اگر پار کرکے جانا ہو — لنگوٹ باندھ لے پھر آدمی یا کہ ننگا ہو
نہیں نکالا تھا ڈاسن نے شو یہاں کیلئے — برہنہ پائی کی بہتر ہے خو' یہاں کیلئے
سمجھ میں اس طرح کچھ اس کی وجہ آتی ہے — یہاں کے لوگوں کو مٹی بہت ہی بھاتی ہے
یہ اوڑھتے ہیں اسی کو وہی بچھاتے ہیں — ملا کے پیئے میں تھوڑی سی ساتھ کھاتے ہیں
لگی ہے چھپروں میں اس صفائی سے کھاڑو — کہ گرد شیور ملے گی ہزار دیں جھاڑو
ملے نہ آپ کو ایندھن تو ان کی کیا غلطی — نہ ہو جو توس میں مکھن تو ان کی کیا غلطی
مگر یہ بات بھی کہنے سے کیسے رہ جائے — یہاں کے لوگ یقیناً ہیں اچھے ہم سائے
شرافت ان میں ہے انسانیت کی عادت بھی — خلوص دل سے یہ کرتے ہیں سب کی خدمت بھی
بندیل کھنڈ میں ہو رومؔی تو اس کا ہوش کرو — فلک کے نیچے رہو جو ملے وہ نوش کرو

کدورہ آنے پر احقر نے حضرت والد محترم مرحوم و مغفور کو اپنے تأثرات پر مشتمل پہلا جو خط لکھا تھا اس میں یہ جملہ بطور خاص لکھا تھا کہ کتابوں میں ”مفلوک الحال“ کا لفظ تو اکثر پڑھنے میں آیا تھا، یہاں اس کا صحیح مصداق دیکھ لیا، بڑے بڑے مالدار فلک زدہ ہو گئے ہیں۔

بڑے ناموں کے نشاں کیسے کیسے — زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ع رہے نام باقی بس اللہ کا

قیام کدورہ کے زمانہ میں ایک بار بارش رُک گئی تو صلوٰۃ الاستسقاء کیلئے
جنگل جانا ہوا، اس موقع پر نواب صاحب موصوف بھی اس نماز طلب باراں میں
شریک ہوئے تھے۔ نواب صاحب کے ولیعہد سلمہٗ کو پڑھایا بھی تھا چنانچہ وہ از
راہِ سعادتمندی دہرہ دون سے آگرہ محض ملاقات کی غرض آئے بھی تھے، اللہ تعالیٰ اُن
کو سلامت اور عافیت سے رکھے۔

قیام اٹاوہ

کدورہ کے اسکول میں میری ملازمت عارضی طور پر ہی تھی کیونکہ میرے
پاس ہائی اسکول کا سرٹیفکٹ نہیں تھا اس لئے اس جگہ پر کسی دوسرے شخص کا تقرر ہو گیا
تو مجھے وہاں سے علیحدہ ہونا پڑا، اسی زمانہ میں میری اپنی ذاتی واقفیت تو یہی ہے کہ
شہر اٹاوہ کے حاجی رئیس الدین عرف چاند میاں کو اپنے بچوں کیلئے کسی اتالیق کی
ضرورت تھی۔ میرا ایک جلسہ کے سلسلہ میں اوریا جانا ہوا۔
اوریا میں ایک ڈاکٹر فرحت صاحب تھے جو عبداللطیف بھائی مرحوم سے
واقف تھے، ان کے یہاں شادی میں شرکت کیلئے آ چکے تھے، ان کے تعلقات حاجی
رئیس الدین صاحب سے بھی تھے، وہی مجھے ساتھ لیکر حاجی رئیس الدین صاحب
چاند میاں کے گھر گئے تھے، اندرونی طور پر کن لوگوں کے واسطے اور سفارش سے یہ
صورت ہوئی تھی کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ مگر عم محترم صوفی صاحبؒ کے
نام بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند میاں سے میرا تذکرہ حضرت مولانا
عبدالشکور صاحب لکھنویؒ یا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ نے فرمایا تھا،
جو بھی واسطہ بنا ہو میرے خیال میں تو جو بات ہے وہ یہ کہ چاند میاں کے گھر تک پہنچنے
سے پہلے میں اوریا کے دار العلوم میں تھا جسے مولوی عبداللہ اعظمی چلا رہے تھے اور وہ

اپنے زمانہ کے مشہور مدرسہ ساز مولوی تھے، جہاں پہنچے تڑ سے ایک مدرسہ قائم کر دیا۔
وہیں ڈاکٹر فرحت سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ حاجی رئیس الدین صاحب
چاند میاں کے یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہاں مجھ سے پہلے میرے ایک ساتھی مولوی
حشمت علی ٹانڈویؒ بھی رہ چکے تھے جنہوں نے قدیم عربی مدارس کی تعلیم کے مطابق
چاند میاں کے لڑکے، لڑکیوں کو یہی فعل، فعلا، فعلوا، ماضی، معروف، مجہول کی گردان
یاد کرانے ہی میں اُلجھا دیا تھا۔ مولانا مشتاق احمد چرتھاولی نے اُسے نہایت مناسب
طور پر دو تین سبقوں میں تقسیم کر کے بات کو آسان کر دیا ہے، غائب کے چھ صیغے،
حاضر کے چھ صیغے، متکلم کے دو صیغے۔ میں نے جا کر بچوں کو منہاج العربیہ شروع کرا
دی جس سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ پہلے ہی دن عربی جملوں کی اُردو اور اُردو کی
عربی بنانے لگے۔ الجمل طویل، الفرس ابیض، الکلب اسود، نفسیاتی طور پر یہ طریقہ
تعلیم قابل قبول اور لائق ہضم ہو جاتا ہے، ایسے گھریلو بچوں کو باقاعدہ عالم و مناظر تو
بنانا نہیں ہوتا۔ اٹاوہ میں میرا قیام اچھا خاصا رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ کدورہ میں وہ جگہ پھر
خالی ہو گئی ہے تو دوبارہ کدورہ جانا ہوا تھا مگر یہ سلسلہ تھوڑے ہی دنوں چلا تھا، اس کے
بعد بخیر و خیر سے گھر کو آ گئے اور الہ آباد کے دائروں سے مدت تک باہر قدم نہیں نکل
سکے تھے کہ ۱۹۷۰ء میں آگرہ کے آب و دانہ کی کشش نے زور کیا اور احقر آگرہ میں
آ گرا۔ فارسی کا مشہور شعر ہے

"دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب و دانہ دگر خاک گور"

انسان کو دو چیزوں کی زور سے بھری کشش کھینچ لیتی ہے، ایک تو آب و دانہ
کی کشش اور دوسری قبر کی مٹی کی کشش، اسی بنیاد پر یہ مصرعہ مشہور ہو گیا ہے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مختصر یہ کہ احقر جو شاید اپنی عمر طبعی کی حد پار کر چکا ہے اب تک تو آب و دانہ

کی کشش ہی کا مشاہدہ و تجربہ کرتا رہا ہے۔اب بجا طور پر دوسری کشش کا منتظر ہے، اس سلسلہ میں تمنائیں اور آرزوئیں تو متعدد ہو سکتی ہیں لیکن یہ ایک تمنا تو ہر حال میں دل کی ہونی ہی چاہئے اور بفضلہٖ تعالیٰ احقر کے دل میں یہ تمنا موجود ہے اور اکثر و بیشتر لوگوں سے اس کیلئے طالب دعا بھی ہوتا رہتا ہے کہ اللہ جہاں بھی موت دے خاتمہ ایمان پر ہو۔ رب توفنی مسلماً و الحقنی بالصلحین o رب لا تذرنی فرداً و انت خیر الوارثین

"یادوں کے چراغ" کے اس تذکرہ میں حاجی رئیس الدین عرف چاند میاں کے تذکرہ سے روشنی یقیناً بڑھنی چاہئے، موصوف بہت ہی مخلص اور دیندار آدمی تھے، اپنی ریاضت اور محنت سے کمائی ہوئی دولت کا بڑا حصہ کارِ خیر ہی میں صرف کرنا چاہتے تھے، اٹاوہ میں مولانا ابرار الحق صاحب علیہ الرحمہ کی سرپرستی میں ان کے مدرسہ اشرف المدارس کی ایک شاخ کے طور پر مدرسہ منبع العلوم قائم کیا تھا لیکن ان کے مزاج میں سیمابی کیفیت کی وجہ سے تلون کی صورت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے ایک موقعہ پر اپنی زمین میں لگی ہوئی فصل کو وقت سے پہلے ہی کٹوا کر وہاں دوسرا کام شروع کرا دیا تھا۔ اسی وجہ سے کوئی پائیدار اور مستقل کام نہ کر سکے اور کسی کام کرنے والے کو انہوں نے پوری طرح ذمہ دار بھی نہیں بنایا اور جلدی جلدی ریل کا انجن بدلتے رہے اس لئے گاڑی آگے نہ بڑھ سکی۔ آدمی مخلص اور بڑے کام کے تھے، اُن کے ذریعہ بہت کچھ کام ہو سکتے تھے لیکن ان کی تلون مزاجی نے گاڑی کو آگے بڑھنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں ان کے اعمالِ خیر کا بیش از بیش بدلہ دے اور جنت نصیب فرمائے۔ آمین

اٹاوہ میں احقر کا قیام ان ہی حاجی رئیس الدین عرف چاند میاں کے مکان پر تھا، اٹاوہ کے ایک مشہور تعلیمی و معاشرتی رہنما مولانا فدا حسین صاحب بھی تھے،

اُنہوں نے اسی زمانہ میں قرآن شریف سے اخذ کر کے چند منتخب آیات کا ترجمہ "قرآن کی روشنی" کے نام سے اُردو میں اور ہندی و انگریزی میں بھی شائع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں احقر نے بھی ان کی کاوشوں کو بغور دیکھا تھا اور پسند کیا تھا۔ چاند میاں اور مولانا فدا حسین صاحب ایک ہی محلّہ میں ضرور رہتے تھے لیکن دونوں کے مزاجوں میں بعد المشرقین تھا، یہ بعد و اختلاف شہر اٹاوہ کی اصلاح میں بھی ہمیشہ قائم ہی رہا، کوئی بھی مصلح اس کی اصلاح نہ کر سکا۔

اٹاوہ میں احقر کے یہ چند مخلص احباب تھے جن کی یادیں برابر آتی رہتی ہیں، مگر اب ان میں سے کوئی بھی بقید حیات باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ان قدر دان محبوں کے نام تو اس تذکرہ میں درج ہو ہی جائیں، یہ حضرات تھے: حکیم عبدالمنان صاحب جو میرے بیحد قدرداں اور مخلص عقیدت مند تھے، ڈاکٹر آفتاب احمد صاحب ہومیو پیتھ، ان کے بھائی خورشید صاحب تاجر پارچہ، حاجی شبیر صاحب اور مدرسہ کے محصل جو گھروں سے آٹے کی چٹکی ہانڈی میں لے جاتے تھے، اور بھی چند حضرات تھے جن کے نام اس وقت تو یاد نہیں آرہے ہیں لیکن ان کی صورتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ مدرسہ منبع العلوم کے موجودہ صدر مدرس مولانا حامد اختر صاحب، مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں میرے ساتھ پڑھ چکے ہیں مگر مظاہر علوم میں مسبوق ہو گئے تھے۔

اٹاوہ میں میرا قیام بالاقساط رہا اور تقریباً تین چار سال تک رہا تھا اور وہیں کے زمانۂ قیام میں سخت تکلیف دہ مکان میں اپنی پہلی تصنیف "دیوبند سے بریلی تک" لکھی جس کی صورت یہ ہوئی کہ محلہ کے ایک پڑوسی حاجی محمد انیس صاحب تھے، دیوبند و بریلی کے اختلاف کو سمجھنا چاہا۔ میں نے انہیں سمجھانے کیلئے اعلیٰ حضرت کے ہاتھ کی صفائی سے بات شروع کی کہ کس طرح تحذیر الناس کی تین مختلف علیحدہ علیحدہ صفحات کی تین عبارات کو ملا کر اس سے ایک عبارت بنا کر سوال کیا گیا ہے تو وہ چونک

پڑے اور کہنے لگے ”یہ باتیں تو سامنے آنی چاہئیں“ چنانچہ میں نے وہیں ”دیوبند سے بریلی تک“ لکھی اور وہیں چاند میاں کے ایک ملازم کے پاس مشتاق نظامی کے ”خون کے آنسو“ نامی کتاب پڑھنے کو مل گئی تو اُس کا جواب بھی لکھ دیا۔ اس وقت میرے پاس صرف ”الجنہ لاہل السنہ“ تھی، گرمی کا موسم تھا لڑکیاں پنکھا جھلتی رہتیں اور میں لکھتا رہتا تھا۔ اٹاوہ کے زمانۂ قیام میں مدرسہ دار العلوم اوریا کی شوریٰ میں شرکت کی وجہ سے وہاں آمد و رفت رہی تھی۔ ۱۹۶۵ء کے قریب الہ آباد کے دائروں میں میرے قدم پھر آگئے اور کدورہ میں نذیر صاحب سے دوستی کے نتیجہ میں ان سے ربط و تعلق اور آنا جانا رہا۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل ریاض الدین صاحب سے بھی راہ و رسم ہوگئی اور انہوں نے کالج کے پرائمری شعبہ میں دینیات پڑھانے، نماز سکھانے کیلئے اسکول میں کام کرنے کا موقعہ دیدیا، کچھ دنوں وہاں رہا لیکن وہاں پرائمری درجات کے ہیڈ ماسٹر صاحب ایک خالص پٹھان تھے اور شیخوں کا پٹھانوں کے ساتھ رہنا ذرا مشکل ہوتا ہے تو وہاں سے علیحدگی اختیار کرکے وکیل انعام الحق صاحب، سکریٹری دولت حسین اسکول کی طلب و خواہش پر دولت حسین میں گوشۂ عافیت تلاش کرلیا جہاں ابتداءً تو پرائمری درجات ہی میں پڑھایا، وہیں الہ آباد وصی آباد کے ڈاکٹر ناظم الدین تو صہیب سلمہٗ کے ساتھ پڑھتے تھے اور ان کا چھوٹا بھائی نجیب الدین مجھ سے پڑھتا تھا۔ یہ دونوں بچے فتح پور کے مشہور بزرگ حضرت نجم الدین شاہ نقشبندی مجذوبؒ کے پرپوتے تھے، بڑے اچھے شریف اور مہذب لڑکے تھے، ان کی نمائش کرنے کیلئے میں ایک روز اپنے گھر پر بھی لایا تھا۔

دین و مذہب کے قدرداں مسلم افسران

جن کی یادیں دل میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں

جناب حشمت علی خاں صاحب مرحوم

احقر ۱۳۹۰ھ اور ۱۹۷۰ء میں مفتی شہر آگرہ کی حیثیت سے آگرہ کی جامع مسجد جہاں آراء میں دار الافتاء سے وابستہ ہوا تھا اُس وقت تو جامع مسجد کی قدیم کمیٹی معطل تھی اور وقف بورڈ کی طرف سے جناب حشمت علی خاں صاحب بطور ایڈمنسٹریٹر (منتظم وقت) کام رہے تھے۔ اُس وقت سے اب تک میرے قیام آگرہ کی مدت ۳۸ سال ہو چکی ہے، احقر کے مشاہدہ و تجربہ کے مطابق انتظامی نقطۂ نظر سے وہی دور دورِ زریں کہا جا سکتا ہے، کچھ دنوں بعد جامع مسجد کی قدیم انتظامیہ کمیٹی جسے اسلامیہ لوکل ایجنسی کے نام سے جانا جاتا ہے وہ سعید اللہ خاں صاحب وکیل کی صدارت میں دوبارہ واپس آگئی۔ سعید اللہ خاں صاحب وکیل تو چاہے جیسے رہے ہوں لیکن خاں صاحب پورے تھے اور کسی قدر احساسِ برتری میں بھی مبتلا تھے، لوکل ایجنسی کے دفتر میں مسند صدارت پر بیٹھنے کے بعد اپنے آپ کو امامِ جامع مسجد اور مفتی شہر کا حاکم و افسر اعلیٰ سمجھنا کسی وقت بھی نہیں بھولتے تھے، اُن کی موجودگی میں بھی اپنی پٹھانی کو بھی ضرور ہی یاد رکھتے تھے اور کسی کسی وقت ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے کی نمائش بھی کر گزرتے تھے لیکن اُن کے خسر صاحب احقر کے بہت قدردان تھے جس کی وجہ سے اُن کے گھر والوں کا بھی برتاؤ میرے ساتھ اچھا رہتا تھا۔

قوت حفظ اور یادداشت اب پنشن کی عمر کو پہنچ چکی ہے، ٹھیک سے تو یاد نہیں ہے لیکن ایسا کچھ ضرور یاد آ رہا ہے کہ میرے کسی سفر حج میں حجاز سے واپسی کے وقت

Scanned by CamScanner

جدہ ایئرپورٹ سے اُن کا ساتھ ہوگیا تھا اور دہلی ایئرپورٹ پر مجھ لدے پھندے زائر کا کچھ سامان لیکر میری مدد کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں آخرت میں سبکدوش رکھیں۔ آمین

خاں صاحب کے بعد دوبارہ حشمت علی خاں صاحب ایڈمنسٹریٹر بنائے گئے جو کسی وزیر کے پارلیمنٹری سکریٹری رہ چکے تھے۔ محلہ لوہا منڈی میں رہتے تھے، اُن کا دورِ انتظام سب سے اچھا تھا، وقت اور ڈیوٹی کے پابند بھی تھے اور مزاج مجلسی قسم کا تھا، اِس وجہ سے مفتی و امام کی عزت بھی کرتے تھے اور ایسا ہی برتاؤ بھی رکھتے تھے۔ کسی وقت مجھ سے ملنا چاہتے تو دفتر کا چپراسی آکر اطلاع دیتا کہ صاحب آنا چاہتے ہیں، اُن کے طرزِ عمل کی وجہ سے میں نے بھی کبھی پیشگی اطلاع کے بغیر اُن سے ملنا نہیں پسند کیا۔ جب ملنا ہوتا پہلے سے اطلاع کر کے ہی ملتا تھا۔ سعید اللہ خاں صاحب کی صدارت میں یہ جو کمیٹی بنی تھی اِس کمیٹی میں سعید اللہ خاں صاحب تو صدر تھے اور منظر الدین احمد ایڈووکیٹ سکریٹری تھے، یہ اِسی قسم کے وکیل تھے جن کیلئے اکبر الہ آبادی جج اپنے تجرباتِ عدالت کی وجہ سے ایک بہت ہی پر لطف اور مبنی بر حقیقت ججمنٹ دے گئے ہیں۔

پیدا ہوا وکیل تو شیطان نے کہا
لو آج میں بھی صاحب اولاد ہو گیا

چنانچہ کچھ دنوں بعد کمیٹی تو گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہو گئی اور منظر الدین صاحب تن تنہا اُس کے ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ موصوف بہت ہی مہذب طور پر مجھ سے پیش آتے تھے اور میں بھی اُن کی قدر شناسی کو قدر کی نگاہوں سے ہی دیکھتا تھا۔ موصوف جس وقت ایڈمنسٹریٹر ہوئے ہیں اُس وقت تک اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی، ہسپتال میں ایک نرس تھی جس کا حقیقی بھائی ان کے زمانہ میں مدرسہ عالیہ میں

بطورِ کلرک ملازم تھا، مدثر اس کا نام تھا، مال کے بازار میں مسجد معتمد خاں کے قریب ہی مکان تھا۔

منظر صاحب نے جب اُس نرس کو اپنے نکاح میں لینا چاہا تو وہ نکاح میں نے ہی پڑھایا تھا لیکن خدا جانے کیسے وہ نکاح شہرت نہ پا سکا اور لوگ اُنہیں کنوارا غیر شادی شدہ ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ منظر صاحب کے انتقال کے بعد جس سے اکثر بالکل ہی بے خبر تھا ایک روز رات کے وقت ایک صاحب آشیانہ ہوٹل میں آئے اور مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ میں منظر صاحب وکیل کا بھائی ہوں، اُن کا انتقال ہوگیا ہے مگر ایک عورت کہہ رہی ہے کہ میں منظر صاحب کی بیوی ہوں، میں نے کہا آپ صحیح جگہ سوال کرنے کیلئے آگئے، وہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے، اُن کا نکاح تو میں نے ہی پڑھایا تھا۔ اِس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی ذکر ہو جائے کہ جس روز میں نے منظر صاحب کا نکاح پڑھایا عصر کے وقت مسجد معتمد خاں میں نماز پڑھنے گیا تو اُسی برادری سے تعلق رکھنے والے ایک حاجی صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا کہ کہئے کیا نکاح پڑھا دیا؟ میں نے کہا ہاں! پڑھا ہی دینا چاہئے تھا اب گناہ تو نہ ہوگا۔ اِس قسم کے بہتیرے معاملات سے مجھے برابر واسطہ پڑتا رہا ہے اور میں نے آنے والے کو لعنت و ملامت کر کے بھگا دینے کے بجائے نکاح پڑھا دینا ہی بہتر سمجھا۔ ایک واقعہ اور بھی یہیں آجائے، جامع مسجد میں صبح کے وقت ایک لڑکا اور ایک لڑکی بھوپال سے آئے اور مجھ سے کہا ہمارا نکاح پڑھا دیں، میں نے کہا بھوپال میں قاضی کی کہاں کمی ہے؟ کہنے لگے ہمارے گھر کے لوگ راضی نہیں ہیں۔ میں نے نکاح پڑھا دیا اور لڑکی نے نکاح کی رسید گھر والوں کو بھیج دی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک سن رسیدہ مہذب بزرگ تشریف لائے اور میری دی ہوئی رسید نکاح دکھلا کر مجھ سے دریافت کیا کہ یہ نکاح آپ نے پڑھایا ہے، میں نے

جواب دیا جی ہاں! میں نے ہی نکاح پڑھایا ہے، تو بولے آپ کو لڑکی کے گھر والوں سے تو پوچھ ہی لینا چاہئے تھا، میں نے کہا لڑکی عاقل بالغ تھی چھوٹی بچی تو نہ تھی اور آپ لوگ لڑکی کی نگرانی اپنے گھر پر بھی نہ کر سکے اور وہ گھر سے نکل کر آگرہ تک آ گئی۔ اب اگر میں نکاح نہ پڑھاتا تو وہ جوان لڑکی لڑکے گناہ ہی کے تو مرتکب ہوتے۔ میں نے اُنہیں حرام کاری و زنا سے بچانے کیلئے نکاح پڑھا دینا ہی بہتر سمجھا۔ جواب سنکر لا جواب ہو گئے اور گھر چلے گئے۔

لوگ ایڈوانس اور ترقی یافتہ بننے کے چکر میں پردۂ شرعی کو اختیار نہیں کرتے اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا کھلم کھلا ملنا ہر جگہ ترقی پسندی اور ایڈوانسڈ ہونے کی نمائش میں برابر پھیلتا جا رہا ہے، ظاہر ہے اُس کے نتیجہ میں یہ ہونا تو یقینی ہے کہ بے حیائی اور عریانیت عام ہو گی، تعلیم کے مقابلہ میں بھی جو صورت رواج پذیر ہے" یقیناً غلط اور خطرہ سے خالی نہیں ہے جیسا کہ اخباریں طبقہ پر روز و روشن کی طرح آشکارا ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

کیا گزری جو ایک ٹِدہ کے عدد ر درو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی دولت بھی گئی بیوی بھی گئی زیور بھی گیا

اکبر مرحوم کا یہ شعر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

مگر افسوس کے ساتھ قلم یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ آجکل فیشن اور انگریزی تعلیم د... م دی مغربی تہذیب کو لوگ بالکل آنکھ بند کر کے اپنانے پر تلے ہوئے ہیں اور جب ملنے... حیا سوز واقعہ رونما ہو جاتا ہے تو اُنہیں رونے کیلئے آنکھوں میں آنسو بھی نہیں ما...

مرحوم اکبر الہ آبادی نے صحیح کہا ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

جناب عبدالحکیم خاں صاحب

منظر الدین صاحب کے بعد وقف بورڈ کی طرف سے جناب عبدالحکیم خاں صاحب اے، ڈی، ایم آگرہ لوکل ایجنسی کے ایڈمنسٹریٹر مقرر ہو کر آئے۔ اُس وقت احقر اپنی دوسری بیٹی کے نکاح کی تقریب میں لگا ہوا تھا اور حضرت والد محترم نکاح میں شرکت کی غرض سے آگرہ آئے ہوئے تھے، نکاح بعد نمازِ جمعہ مسجد ٹال حبیب اللہ میں ہونا تھا۔ احقر نے عبدالحکیم خاں صاحب کو بھی تقریب میں مدعو کیا تھا، وہ والد صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور الہ آباد کے کسی مشاعرہ میں والد صاحب سے سنا ہوا یہ مصرعہ پڑھ کر اُن سے معانقہ کیا

ہم تھے کہ اُڑ گئے صف محشر لئے ہوئے

یہ الہ آباد میں والد صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے، اچھے وضع دار آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین

سیّد سعید اللہ صاحب الہ آبادی

عبدالحکیم خاں صاحب کے بعد ایڈمنسٹریٹر ہوئے جو الہ آباد میں آفیسر ٹریننگ اسکول کے وائس پرنسپل تھے اور الہ آباد میں احقر اُن کے گھر پر متعدد بچوں کو قرآن مجید پڑھا چکا تھا۔ یہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے، اُن کے ایک چھوٹے بھائی گورنمنٹ کالج الہ آباد میں مجھ سے پڑھ چکے تھے، اُن کا نام وحید اللہ تھا۔

اشرف اللہ خاں صاحب الہ آبادی

یہ الہ آباد میں اُسی محلہ (حسن منزل) میں رہتے تھے جہاں ہمارا مکان تھا اور محلہ کی مسجد میں احقر ہی نماز پڑھاتا تھا اور اُن لوگوں کو متوجہ کر کے مسجد کا حاضر باش نمازی بننے کی سعادت حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

یہ آگرہ جب آئے تھے تو اُس وقت تو ریلوے مجسٹریٹ تھے لیکن حق تعالیٰ نے اُنہیں اِس لائن کے آخری مرحلہ تک ترقی دی اور یہ بورڈ آف ریوینو کے ممبر ہونے کے بعد ہی رٹائرڈ ہوئے۔ میرا اُن کا تعلق وطن کا تعلق بھی تھا، محلّہ کا بھی اور بہت پرانا تھا۔ اُن کا میرے یہاں برابر آنا جانا رہا، اُن کے بچوں کو قرآن شریف بھی پڑھایا۔ ایسی صورت میں یادوں کے چراغ میں اُن کا ذکر کسی پہلو سے بھی قابل غور وفکر کسی کیلئے بھی نہ ہونا چاہئے۔

میرے ایک بہت پرانے ملاقاتی اور اہل تعلق ومحبت مولوی یونس صاحب بنارسی ہیں جو ابھی کچھ دنوں پہلے آگرہ میں بھی ملنے آئے تھے، اُن کا کوئی معاملہ بورڈ آف ریوینو میں آ گیا تھا۔ وہ آئے تو میں اُنہیں لیکر اُن کے بنگلے پر گیا جو الہ آباد میں کچہری کے قریب ہی تھا، اُنہوں نے اُن کا کام کر دیا تھا تو مولوی صاحب بعد میں شکریہ ادا کرنے کیلئے بھی آئے۔

جناب آغا محی الدین صاحب میرٹھی

سید سعید اللہ صاحب کے بعد ایڈمنسٹریٹر کی جگہ پر آغا محی الدین صاحب لوکل ایجنسی کے ایڈمنسٹریٹر ہوئے۔ یہ محکمہ پولس میں آئی جی کی حیثیت سے رہ چکے تھے، لمبے تڑنگے بنچے ہوئے آدمی تھے، پولس کے محکمہ میں تو یقیناً فٹ رہے ہوں گے۔ اسی کیفیت میں وہ یہاں آ گئے اور آنے کے بعد جلد ہی جامع مسجد کے پرانے کرایہ دار

ہوٹل سبحان اللہ والوں سے اُنہوں نے وہی پولس لائن والا طریقہ اپنانا چاہا۔ ہوٹل والوں نے اُن کا نشہ اُتار دیا۔ بلاوجہ کرکری ہو مگر پھر سنبھل گئے، مجھ سے تو قاعدے ہی ملتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے زمانہ میں پی، اے، سی، کے ایک ریٹائرڈ کو اپنا معین اور دست راست بنالیا تھا۔

اجمیر شریف کے عرس کے موقع پر جمعہ کے روز مسجد میں شامیانہ کی کمی پر لوگوں کو دھوپ میں نماز پڑھنی پڑی اور دھوپ سے تلملا کر لوگوں نے اُن صاحب کی پٹائی کر کے شاید حوض میں غوطہ کھلا دیا۔ میں اُن دنوں حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری سے ملاقات کیلئے راندیر اور سورت گیا ہوا تھا، واپسی پر اِس واقعہ کی اطلاع ملی اور ایڈمنسٹریٹر صاحب نے مجھ سے استفتاء کیا کہ عرس کی واپسی پر جامع مسجد میں زائرین ٹھہرتے ہیں جن میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں، مسجد کی گندگی اور بے حرمتی ہوتی ہے اُس کا شرعی حکم کیا ہے۔ میں نے جواب میں لکھ دیا کہ استفتاء ایسی بات کا ہونا چاہئے جو آدمی کو معلوم نہ ہو اور مسجد کی بے حرمتی سے متعلق ہر مسلمان جانتا ہے کہ بے حرمتی نہ ہونی چاہئے۔ باقی حدیث شریف میں آیا ہے کہ تم کوئی برائی ہوتے دیکھو تو اگر اُسے ہاتھ سے روک سکتے ہو تو ہاتھ سے روک دو، زبان سے روک سکتے ہو تو زبان سے روک دو ورنہ دل سے برا سمجھو۔ اب آپ اپنے کو دیکھ لیں جو کر سکتے ہوں کریں۔ وہ پولس کے آدمی تھے میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہتے تھے میں نے اپنا کندھا دینا پسند نہ کیا اور جواب بھی دیدیا۔

آئی جی صاحب کی دلی مراد پوری نہ ہو سکی جس کا افسوس احقر کو بھی ہے۔

اسی طرح کا دوسرا واقعہ بھی یہاں ذکر ہو جائے تو ناظرین کو راقم الحروف کو پہچاننے میں کچھ نہ کچھ مدد تو ضرور ہی مل جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ موسم گرما میں آگرہ کے شیخ صاحبان نے (جو یہاں خاصی تعداد میں اور اچھی مالی خوشحالی کیساتھ موجود ہیں)

دفتر والوں سے مطالبہ کیا کہ جمعہ کے روز مسجد میں برف کے ٹھنڈے پانی کا انتظام ہونا چاہئے، دفتر والوں نے اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے احقر سے استفسار کرلیا جس کا میں نے یہ جواب دیا کہ شہزادی جہاں آراء کا وقف نامہ دیکھ لیا جائے، آمدنی مسجد میں جو اخراجات دئے گئے ہیں اگر اُس میں برف کے پانی کی مد بھی ہو تو نظم کر دیا جائے۔

مشاہیر اکبر آباد

احقر کے ایک محسن، قدرشناس، محب مخلص حکیم سیّد سلطان احمد نیازی مرحوم

احقر جب مفتی شہر کی حیثیت سے شہر تاج اکبر آباد آیا تو اہل آگرہ میں سے صرف ایک یہی حکیم صاحب مرحوم ومغفور ایسے تھے جنہوں نے احقر سے راہ ورسم پیدا کرنے اور ملاقات میں پہل کرنے کی ایسی شریفانہ اور سیّدانہ کوشش کی کہ جس کا ذکر نہ کرنا زبردست محسن ناشناسی ہوگی۔ آگرہ آنے پر تقریباً ڈیڑھ دو سال تک میرا قیام دو مسجدوں میں رہا، شروع کے دو چار دن جامع مسجد کے حجرہ میں ہی قیام رہا تھا مگر مچھروں کی زبردست یورش نے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر کے مجھے کناری بازار کی مسجد اکبری کے شمالی کمرہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا اور میں اسی حجرہ میں فروکش ہو چکا تھا۔ حکیم صاحب بیچارے مجھ سے ملنے کیلئے شاید دو تین بار آکر ملاقات کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے تو مجھے اپنی غیر حاضری پر بہت ندامت ہوئی اور میں خود فراش (دربان) مسجد کی رہنمائی میں حکیم صاحب کے دولت خانہ و دواخانہ پر جاکر ان سے ملاقات کیلئے جانے پر مجبور ہو گیا اور ان کے مطب میں ان سے ملاقات کر لی، اس کے بعد انہی کے ساتھ آگرہ کے ایڈیشنل کمشنر جناب سیّد حسین صاحبؒ سے ملاقات کی اور برابر ہم دونوں کا ساتھ ساتھ کمشنر صاحب کے بنگلہ پر آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ حکیم صاحب مرحوم ومغفور نے بڑی دلچسپی سے مجھے آگرہ کی مشہور

واہم شخصیات سے متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کر دیا اور بہت جلد مجھے شہر کے مشاہیر سے ملا دیا، یہ ملاقاتیں بہرحال کام آئیں کیونکہ میرے آگرہ آنے کے بعد شہر

کے ایک کٹر رضا خانی نے دیوبند و بریلی کے درمیان متنازع موضوعات سے متعلق

سوالات کا لا متناہی سلسلہ شروع کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ موضوعات میرے لئے پریشان کن نہیں بن سکے، ایک ایک دن میں سات سات سوالات استفتاء فارم پر لکھ کر لائے جاتے اور میں سب کے جوابات دے دیتا، کچھ دنوں بعد ایک بے تکلف جماعتی رضا خانی صاحبؒ نے مجھ سے بڑی بے تکلفی سے کہا کہ آپ کے جوابات بڑے سیاسی قسم کے ہوتے ہیں، میں نے کہا کہ آپ لوگوں کے سوالات بھی تو سیاسی ہوتے ہیں، اسی لحاظ سے میں بھی سیاسی جواب دیتا ہوں، اس لئے کہ اصول افتاء یہی ہے کہ جواب سوال کے مطابق ہی ہونا چاہئے۔ کچھ دنوں کے بعد دو بڑے صفحات کا پوسٹر میں نے تیار کیا جس پر ایک طرف سرخی تھی ''علماء دیوبند کا مقدمہ اعلیٰ حضرت کے اجلاس میں'' اور دوسری طرف کی سرخی تھی ''اعلیٰ حضرت کا مقدمہ علماء دیوبند کے اجلاس میں''۔ یہ اشتہار بحمدہٖ تعالیٰ بہت کامیاب اور عام پسند ہوا تھا۔ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب نے بھی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ حکیم صاحب مرحوم نے نیازی مسلک سے تعلق رکھنے کے باوجود اس اشتہار کو طبع کرایا تھا، اس سے ان کی انصاف پسندی اور احقر سے تعلق و ہمدردی ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے آمین۔ حکیم صاحب کے صاحبزادگان گرامی حکیم برہان احمد نیازی سلمہٗ تو ماشاء اللہ الولد سر لابیہ کا مصداق ہیں البتہ عزیزم رضوان سلمہٗ آگرہ اور بریلی والوں کے زیر اثر تاجر اور شاعر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ خوش وخرم رکھے۔ آمین

جناب میکشؔ اکبرآبادی اور بعض احباب آگرہ

آگرہ کے چند ادیبوں کے نام سے کان آشنا تھے سیمابؔ اکبرآبادی، آل احمد اکبرآبادی، میکشؔ اکبرآبادی، ان میں سے ایک صاحب تو میرے آگرہ آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے یعنی سیماب صاحب، دو صاحبان یعنی آل احمد صاحب اور حضرت میکشؔ بقید حیات تھے، اس لئے ان دونوں سے ملاقات ہو گئی۔ آل احمد صاحب آگرہ کے مشہور وکیل اور جامع مسجد کی کمیٹی کے سکریٹری و ایڈمنسٹریٹر منظر الدین احمد صاحب کے جد بزرگوار تھے، آل احمد صاحب کے بعض ادبی مضامین طالب علمی کے زمانہ میں ادبی رسالوں میں پڑھ چکا تھا، غائبانہ تعارف تھا لیکن میکشؔ صاحب مرحوم ومغفور کا صرف نام جانتا تھا، ان کی شاعری اور ان کی تنقیدی تحریریں (نقد اقبالؔ وغیرہ) پڑھنے کی نوبت آگرہ آنے پر ہی آسکی۔ میکشؔ صاحب اپنی خاندانی شرافت اور مرنجاں مرنج صوفیانہ مزاجی کی مجسم تصویر تھے، مسلکی اختلاف کے باوجود احقر سے مخلصانہ اور ہمدردانہ انداز کا معاملہ رکھتے تھے، احقر نے انہیں اپنی کتاب ''دیوبند سے بریلی تک'' پڑھنے کو دی تھی، پڑھ کر اس پر کوئی بحث وتنقید نہیں کی، بس اتنا فرمایا کہ ''اب آپ کے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ اس کتاب کو یہاں دوسروں کو نہ دکھلائیں تو بہتر ہے''۔ وہ میرے والد صاحب کے ہم عمر رہے ہوں گے۔ آگرہ میں احقر کے اس طویل قیام میں جن مخلصین اہل تعلق کی کمی برابر محسوس ہوتی ہے ان میں ان دونوں (دوست اور بزرگ) کی کمی بھی برابر محسوس ہوتی رہتی ہے، ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ احقر نے اہل آگرہ کی تین نسلوں کو دیکھا ہے' بوڑھے جو ایک ایک کر کے ختم ہو گئے، جوان جو بوڑھے ہو رہے ہیں، بچے جو جوان ہو چکے ہیں۔ بوڑھوں میں حاجی تصور حسین تصو، حاجی عبدالرشید مرحوم ڈھولی کھال جن کے لائق صاحبزادہ عزیزم محمد یعقوب سلمہٗ اب تک اسی سعادت مندی سے پیش

آتے ہیں (انہوں نے اپنے گھر پر رہنے کی پیش کش بھی کی تھی)۔ کم عمر لڑکوں میں یہ چند بچے ابھی تک میرے کام آتے رہتے ہیں، جاوید، ماجد ولد حاجی شکیل، عظیم الدین ولد سلیم الدین مرحوم۔ ان سے بڑی عمر کے لوگوں میں حاجی مدن مرحوم کے صاحبزادگان نعیم وشکیل وشمیم بلکہ ان کے سب گھر والے، حاجی محمد عقیل پرفیومر احقر کے روزِ اوّل سے قدر شناس اور قدرداں ہیں جو پوری ہمدردی کے ساتھ برابر تعلق کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ عطر کے علاوہ گزک بھی بھیجتے رہتے ہیں جو ان کی دُکان کے قریب ہی بکتی ہے۔

قند مکرر

قدردانانِ آگرہ

اہل آگرہ کے قدردانوں کی فہرست کی صدارت کیلئے ایک ایسی شخصیت کا نام ذہن میں برابر گردش کر رہا ہے کہ اب تک قلم کو روکے رہا کہ پہلے ایسے لوگوں کا ذکر کرلوں جن کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ کہیں مضمون کے طول پکڑنے کی وجہ سے ان کا نام ذہن سے نکل نہ جائے، لیجئے اب قدردان آگرہ کے سلسلہ میں جیمس شو کمپنی، شوماز کیٹ اور چھم چھم گلی آگرہ کے چند قدردانوں کا تذکرہ پڑھ لیجئے۔ احقر کے آگرہ آنے کے بعد ایسا لگا کہ اہل بدعت خالص رضا خانیوں کے سر پر قیامت ہی آگئی اور اختلافی موضوعات پر سوالات کی برسات لگ گئی، اس موقع پر چھم چھم گلی کے چند بزرگوں نے خاص طور پر احقر کی نصرت وحمایت کا بیڑا اُٹھالیا جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔ حاجی محمد مسلم جو بعد میں پاکستان چلے گئے، حاجی محمد ادریس صاحب چھم چھم گلی، موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں نمایاں طور پر ساتھ دیا، مالی تعاون کیلئے اپنے یہاں اُردو، فارسی پڑھانے کیلئے ٹیوشن کا کام لیا۔ حاجی شان الٰہی صاحب

اپنے انداز مین حمایت وتقویت فرماتے رہے جسے ان کے بعد ان کے خواہر زادہ عزیزم ہاشم سلمہٗ نے بالکل بے مثال انداز میں مجھے آگرہ ہی میں قیام کا پابند بنالیا۔ ان کا یہ طرزِ عمل ہنوز قائم وجاری ہے جس کیلئے ایک پردیسی مسافر مفتی صرف جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء ہی کہہ سکتا ہے۔ اس قدر سرگزشت کے بعد اپنی اُصول پسندی اور اُصول کی پابندی سے متعلق ایک قابل ذکر واقعہ بھی یہاں تحریر میں قلمبند ہو جائے تو بہتر ہی ہوگا، وہ واقعہ یہ ہے کہ چھم چھم گلی کے ایک ضعیف سوداگر صاحب اپنی جائیداد میراث سے متعلق کچھ وصیت کرنا چاہتے تھے جس کا ذکر اور جس کے بارے میں مجھ سے وہ بہت پہلے مشورہ بھی کر چکے تھے اور مشورہ کے بعد وہ اپنی جائیداد کو زبانی طور پر ہبہ کر چکے تھے، ان کے انتقال کے بعد جو لوگ اس جائیداد کے وارث وحصہ دار بن سکتے تھے انہوں نے ان کی اہلیہ سے وہ مکان خالی کرانا چاہا، وہ معاملہ اُلجھ گیا تو حاجی ادریس صاحب نے استفتاء کیا کہ مورث نے زبانی طور پر ہبہ کر دیا تھا اور موہوب لہٗ کا اس پر قبضہ ہو چکا تھا تو کیا اب وہ مکان میراث بنے گا، جواب دیا گیا کہ زبانی ہبہ کرا دینے سے بھی قبضہ کے بعد پوری طرح ہبہ ہو جاتا ہے لہٰذا وہ میراث نہ بنے گا۔ اس کے بعد اسی معاملہ سے متعلق ایک استفتاء عزیزم ہاشم سلمہٗ نے کیا تو میں نے اپنے مقررہ اُصول کے مطابق یہ جواب دیا کہ اس معاملہ سے متعلق ایک استفتاء کا جواب دیا جا چکا ہے اور احقر ایک ہی مسئلہ سے متعلق کوئی جواب پہلے لکھ چکنے کے بعد اسی معاملہ کے متعلق دوبارہ جواب نہیں دیتا، یہ بات عزیزم ہاشم سلمہٗ کی طبعی اور خاندانی شرافت کہی جانے ہی کی مستحق ہے کہ انہوں نے اپنی مرضی کے خلاف میرے جواب پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، احقر نے ان کے اس طرزِ عمل کی قدر اپنے دل میں برابر کی ہے اور بوقت ضرورت اس کا اظہار بھی کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ اپنی راہ ورضا پر قائم اور بخیر وعافیت تادیر زندہ وسلامت رکھے۔ آمین

ایک حقیقت جس کا اظہار ضروری ہے

احقر جب آگرہ آیا تو حاجی رفیع الدین چھپی ٹولہ نے عزیزم آصف زیدی سے مجھے متعارف کرا دیا تھا، بابری مسجد کی شہادت کے بعد احقر آگرہ آیا تو کچھ دن محلّہ قردل پاڑہ میں ایک سوداگر صاحب کے مکان پر قیام رہا۔ اسکے بعد مولانا محمد میاںؒ امام مسجد ٹال حبیب اللہ کے حجرہ سے ملے ہوئے دوسرے حجرہ میں قیام کا فیصلہ کر کے وہیں رہنا شروع کر دیا، اسی دور میں عزیزم آصف زیدی وہاں کبھی کبھی آجاتے تھے اور میں بھی ان کی دُکان پر چلا جاتا تھا، ایک روز عزیزم آصف زیدی نے کہا کہ آپ کا قیام اس حجرہ میں اچھا نہیں لگتا اور انہوں نے پنی گلی کے اپنے مکان کے بیرونی کمرہ میں میرے قیام کا نظم کر دیا جہاں میں شاید چھ سات سال تک قیام پذیر رہا اور برابر الہ آباد آتا جاتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں اہلیہ مرحومہ راہی خلد ہو کر اپنے وطن اصلی جنت الخلد چلی گئیں، رحمہا اللہ تعالیٰ وارضاہا۔

جب اہل خانہ نہیں تو خانہ کہاں؟

اس لئے خانہ بدوش رہتا ہوں

غمخوار کے نام نامۂ غم

مــــــع

قطعۂ تاریخ وفات

اے شریک زندگی مہجور کا لے لو سلام　　حق تعالیٰ رہنے کو بخشے تمہیں دار السلام
تم شریک زندگی تھیں بے وفائی کر گئیں　　چھوڑ کر تنہا مجھے اللہ میاں کے گھر گئیں
ہاتھ جب پکڑا تھا تم نے کیسے چھوڑا میرا ہاتھ　　جی چکا میں بھی بہت لے لیتیں تم مجھ کو بھی ساتھ
جب جمادی الثانیہ کا چاند نکلا شام کو　　اور اُسنے بخشی زینت چرخ نیلی فام کو
چاند میری زیست کا اس دم گہن میں آ گیا　　تم نے بھی پہنا کفن چہرہ کفن میں آ گیا
ایک دن پہلے سورج گرہن کا دیکھا تھا سماں　　دوسرے دن چاند گرہن کا ہوا منظر یہاں
ماہِ نو ڈوبا نکل کر ظلمت شب چھا گئی　　دل پہ چھائی اک گھٹا اور اشک غم برسا گئی
آیت ''منہا خلقنا'' پڑھ کے دی مٹی تمہیں　　یوں لگا ارض و سما کی رُک گئی ہیں گردشیں
تم پہ میں یوں خاک ڈالوں گا کبھی سوچا نہ تھا　　حکم حق تو ماننا تھا لازماً کرنا پڑا
میں نے دل پہ رکھ کے پتھر خاک ڈالی کیا کہوں　　آگ سینے میں لگا کر خاک ڈالی کیا کہوں
تم متاعِ زندگی تھیں دفن مٹی میں ہوئیں　　پاس دارِ دوستی تھیں دفن مٹی میں ہوئیں
دفن کر کے میں تمہیں دنیا میں تنہا رہ گیا　　خاک جھاڑی ہاتھ سے اور ہاتھ ملتا رہ گیا
ڈال دی ہے حق نے دل میں ایسی تاریخ وفات　　ہو گئی جس سے تسلی دامن صبر آیا ہات

دفعتہً ہاتف نے دی آواز لو رومی سنو
''داخل فردوس حفصہ فی امان اللہ'' کہو

۱۴۱۶ھ

احقر کے قیام آگرہ کے اڑتیس سالہ طویل مدت میں ان دو عزیز محبین کو بہت

بڑا دخل ہے، ویسے اصل لطف و مہربانی تو حق تعالیٰ ہی کی ہے جس پر دل سے یقین اور ایمان رکھنا ضروری ہے لیکن اسکے بعد ان دونوں محسنوں کے احسان کا ذکر نہ کرنا بلا شبہ یقیناً احسان فراموشی اور محسن ناشناسی ہی کہنا پڑے گی۔ عزیزم آصف زیدی نے آگرہ میں نو وارد پردیسی مسافر مفتی کا اپنے ساتھ قیام وطعام کا نظم کیا، اسکے بعد مرحوم حاجی مدن کے چھوٹے صاحبزادہ حاجی شمو نے اپنے ہوٹل میں قیام اور اپنے گھر کھانے کا انتظام کر کے قیام وطعام کا دونوں نے معاملہ حل کر دیا اور عزیزم ہاشم سلمہٗ نے بھی طعام کا نظم اپنے یہاں کر لیا جو ابھی ماضی قریب تک چلتا رہا تھا، اب انکا مزید احسان احقر کو کچھ محسوس ہونے لگا تو کچھ دنوں سے ملازم ہوٹل بابو کے گھر پر کھانے کا نظم کرنا چاہا تھا مگر عزیزم شکیل ولد حاجی مدن مرحوم نے بابو سے کہہ دیا کہ کھانا میرے ہی گھر سے لے جایا کرو، کھانا اب انہی کے گھر سے آ رہا ہے کہ سفر دہرہ دون و سہارنپور پیش آ گیا، اسی سفر میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، یہاں سے واپسی کے بعد آگرہ میں کچھ قیام کر کے الہ آباد اپنے گھر رہنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ فرما رکھا ہوگا وہی رو بہ عمل ہوگا۔ احقر کی عمر طبعی بفضلہٖ تعالیٰ پوری ہو چکی ہے، عمر اضافی کا دور چل رہا ہے۔ ماضی میں احقر متعدد بار پوری مدت حیات میں طویل بیماریاں جھیل کر شفایاب ہوتا رہا اب اندازہ وخیال کچھ یہی ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب طویل بیماری نہ آئے گی، چیتاونی کئی بار ہو چکی ہے شیطان و نفس نے زیادہ جینے کا موقع ہی نہیں دیا، اب تو شاید وارنٹ ہی آ گیا اور قیدی کو گرفتاروں کے لباسِ کفن میں ہی حاضر عدالت ہونا ہے، اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین اور بادشاہوں کے شہنشاہ ہیں ان کی عدالت عظمیٰ (اصل سپریم کورٹ) میں پیشی ہونی ہے، امید یہی ہے کہ سب سے بڑی عدالت سے رحم کی درخواست ضرور منظور ہو جائے گی اور مراحم خسروانہ کے تحت سزائے جہنم معاف ہو جائے گی۔

شہر تاج آگرہ کے چند قدر رداں، کرم فرما محبین، مخلصین اور چند خدمت گزار، عزیزانِ باشعور و سلیقہ شعار

شہر تاج آگرہ میں تقریباً تہائی صدی کی مدت میں احقر نے یہاں کی تین نسلیں دیکھیں، کچھ بوڑھے دیکھے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں احقر مہربان کہنا زیادہ صحیح سمجھتا ہے۔ بوڑھے لوگ تو دھیرے دھیرے راہیٔ آخرت ہو گئے، جو جوان دیکھے تھے وہ اب میرے ساتھ بوڑھے ہو رہے ہیں، کچھ چھوٹے بچے دیکھے تھے جن میں کچھ کی شادی ہو چکی ہے اور اولاد والے ہو چکے ہیں اور کچھ ابھی تک بچے ہی ہیں کسی بچے کے باپ نہیں بنے ہیں۔

جو حضرات انتقال فرما چکے ہیں ان کے حق میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت نصیب کرے، بڑے موجود لوگوں میں جو لوگ مجھ سے زیادہ محبت و قدر دانی کا برتاؤ کرتے تھے ان کی فہرست تو بہت لمبی ہے، یہاں روزآنہ آنے جانے والے لوگوں میں قابل ذکر ماسٹر محمد علی صاحب (سابق پرنسپل شعیب محمدیہ کالج آگرہ)۔ شعیب محمدیہ کالج کے موجودہ مینیجر جمیل الدین قریشی اور ان کے بہنوئی ماسٹر ابوالحسن قریشی بھی گاہے گاہے تشریف لاتے اور خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بھائی ہارون، عزیزم شکیل و شمیم (صاحبزادگان حاجی مدن مرحوم)، چھوٹے بچوں میں ملازم ہوٹل بابو کے بعد سب سے پہلے صبح آنے والے عزیزم جاوید (جن کا تعلق بہت پرانا ہے) روزآنہ آتے ہیں۔

۱۹۹۲ء کے بعد جب میرا قیام آصف زیدی سلمہٗ کے گھر ہوا اور وہیں چھ سات سال تک قیام رہا، جاوید سلمہٗ اسی وقت سے میری خدمت و راحت رسانی میں مصروف ہے۔

ہوٹل آشیانہ جامع مسجد کے صدر دروازہ کے عین سامنے بھرے بازار میں ہے جس کے سامنے جامع مسجد اور عقب میں آگرہ فورٹ ریلوے اسٹیشن ہے۔ بازار میں ہونے کی وجہ سے حاجی شکیل جن کی جوتوں کی دُکان ہوٹل کے قریب ہی ہے ان کے صاحبزادے محمد ماجد سلمہٗ بھی جاوید ہی جیسی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ جاوید و ماجد دونوں ہی تاجر ہیں اس لئے دنیاوی معاملات کی اچھی سوجھ بوجھ اور واقفیت رکھتے ہیں۔ اُوپر بھائی ہارون کے تذکرہ میں ان کے والد مرحوم استاد علیم الدین کا ذکر رہ گیا، یہ استاد مجھ سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے اور میرے آگرہ آنے پر رضا خانیوں کو جو بخار چڑھا تھا اس بخار کے اتارنے میں ان کی استادی سے بہت مدد ملی تھی۔

آگرہ میں اتنی طویل مدت تک مسلسل قیام احقر کا اپنے پیدائشی وطن الہ آباد میں بھی نہیں رہا، اس وجہ سے میرے اہل محبت و تعلق کی تعداد الہ آباد کے مقابلہ میں یہاں کچھ زیادہ ہو گئی ہے لیکن ان سب کا تذکرہ اگر نام بنام علیحدہ علیحدہ لکھا جائے تو شاید میری عمر کی بقیہ مدت جواب کچھ زیادہ نہ باقی رہی ہوگی اس کی تفصیل پیش کرنے کیلئے کافی نہ ہوگی، اس وجہ سے اپنے دل کو سمجھاتے اور قلم کو روکتے ہوئے چند زیادہ تعلق رکھنے والے اہل تعلق مخلصین و محبین کے تذکرہ پر اکتفا کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، جن اہل محبت و تعلق نے احقر سے محبت و تعلق کا معاملہ رکھا ہے انہیں اس کا بدلہ حق تعالیٰ ہی عطا فرمائیں گے جو شہنشاہِ حقیقی اور مالک کائنات کی طرف سے ملنے والا بدلہ ہوگا جس کی برابری کوئی انسانی بدلہ کر ہی نہیں سکتا۔

یادوں کے اس چراغ میں ان کا تذکرہ ایک فانی انسان کے دنیاوی قلم سے لکھا ہوا تذکرہ ہے جسے بقا و دوام حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ ان مخلصین و محبین کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو انعام ملے گا وہ تو انکے نوشتۂ تقدیر میں روزِ اوّل ہی لکھا جا چکا ہے

جو روزِ جزا تک انکے نامۂ اعمال میں چمکتا رہے گا۔ جزاهم الله تعالیٰ احسن الجزاء

اللہ تعالیٰ نے اچھے کاموں کا اچھا بدلہ دینے کیلئے ہمیں متوجہ فرمایا اور اپنے شاہی انداز میں حکم دیا ہے هل جزاء الاحسان الاالاحسان۔ اس حکم خداوندی پر عمل کرتے ہوئے مختصر طور پر اپنے قریبی اہل تعلق محسنین کا اظہارِ تشکر کے طور پر ذکر کرنا احقر کا اخلاقی فرض ہے جس کی ادائیگی احقر کو بہر حال کرنی ہے۔

اُوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ میں احقر آگرہ آیا تھا، اس وقت جامع مسجد کے حجرہ میں دو چار روز رہنے کے بعد اکبری مسجد میں چلا گیا تھا۔

حافظ قاری سیّد شفیع الحق صاحب پور قاضوی رحمہ اللہ تعالیٰ

یہ یہاں امام مسجد تھے۔ قاری صاحب موصوف نے مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں حضرت قاری عبدالمعبود صاحبؒ سے تجوید پڑھی تھی، آپ احقر کے استاد محترم ناظم اعلیٰ مدرسہ مظاہر علوم استاذ الکل حضرت مولانا حافظ سیّد عبداللطیف صاحبؒ کے بھتیجے تھے اور مرشد برحق حضرت مولانا ابرار الحق صاحب حقیؒ کے ہم سبق بھی رہے تھے۔ مسجد اکبری کناری بازار میں سر بازار بنی ہوئی ہے، احقر بھی قاری صاحب کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک اسی مسجد کے ایک بڑے اور کشادہ کمرے میں مقیم رہا ہے، اس لئے قاری صاحب سے بہت زیادہ قرب و تعلق رہا، ان کے مزاج میں سیادت نمایاں طور پر تھی، مسلمانوں کے محلوں میں امام مسجد کیلئے کھانے کی کمی نہیں رہتی چنانچہ وہ اکثر اتوار کو ناشتہ کی دعوت کر دیا کرتے تھے۔ رمضان شریف میں وہ بہت تیز خوانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے تھے اور عشاء کا وقت شروع ہوتے ہی نمازِ عشاء اور اس کے بعد تراویح ہوتی، تقریباً گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں لوگ فارغ ہو جاتے تھے، اس لئے بہت سے لوگ وہیں تراویح پڑھنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے خوب آدمی تھے۔

مولانا حافظ قاری محمد میاںؒ خطیب مسجد ٹال حبیب اللہ آگرہ

آگرہ کے خاص محبین اور قدر دانوں میں مسجد ٹال حبیب اللہ کے امام مرحوم و مغفور مولانا محمد میاں صاحب بھی تھے جنہیں اپنے قدر دانوں کا بھی امام لکھ دیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا نہ بے محل۔ موصوف دتیہ ضلع جھانسی کے رہنے والے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں پڑھا تھا۔ مولوی ریاست علی بجنوری نے ان سے زمانۂ طالبعلمی میں فارسی کی بعض کتابیں خارج میں پڑھی تھیں لیکن فارسی کا ایک بہت ہی بامعنیٰ مقولہ ضرب المثل ہے "ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" نمک کی کان میں جو بھی گیا وہ بھی نمک ہی بن گیا۔ بات یہاں تک مشہور ہے کہ نمک کی کان میں پورا ایک گدھا چلا گیا تھا اور وہ بھی ایک مدت کے بعد نمک ہی بن گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے بعد نمک ہو جانے کی وجہ سے کتنوں کے کھانوں میں بھی شامل ہو گیا ہوگا۔ یہ دارالعلوم دیوبند سے آنے کے بعد آگرہ آگئے جو علم دین کی روشنی سے خاصی حد تک اب بھی دور ہی ہے۔ تیجہ، چالیسواں، برسی وغیرہ کے کھانوں کی دھوم دھام کے ساتھ ساتھ عرسوں اور قوالیوں کی تام جھام کی بھی بڑی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ یہاں انہیں اپنی قاسمیت (دیوبندیت) کو باقی رکھنا مشکل ہو گیا بلکہ بات تو یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ "دیوبند سے بریلی تک" نامی کتاب کے مصنف کو مفتی شہر کی حیثیت سے برداشت کرنا بھی دشوار ہی ہو چکا تھا۔ یہ اور ان کے یارِ غار مولانا محمد عارف صاحب امام مسجد چھم چھم گلی، دونوں ہی کو احقر کی کٹر دیوبندیت نہ پسند تھی نہ گوارا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو اپنا ہی بندہ بنانا اور رکھنا چاہا تو احقر کو ہمت دے دی اور احقر نے جامع مسجد آگرہ کے در و دیوار اور محراب و منبر کو گواہ بنا کر اپنے مسلک حق کا برملا اعلان کیا اور آج تک اسی کا پیرو اور عامل و علمبردار بنایا۔ فلله الحمد وله الشكر

زندگی کا آخری دور ضعیفی چل رہا ہے، کسی وقت بھی احکم الحاکمین اللہ رب العالمین کی طرف سے بلاوا آسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے اور ہمارے تمام محبین کے جملہ معاصی اور قصور سے درگزر فرما کر بلا حساب وعذاب جنت کے داخلہ ہی کیلئے طلب فرمائیں۔ آمین

اللہ تعالیٰ اس بندہ پر بھی رحم فرمائے جو اسے پڑھ کر آمین کہے۔

استاذ علیم الدین اور ان کے صاحبزادے ہارون

آگرہ آنے پر احقر کو یہاں چند نامی گرامی مہربانوں سے ایسا سابقہ پڑا تھا جو شاید مرتے وقت ہی بھلایا جاسکے گا۔ ایسے لوگوں میں یہ بعض نام تو رضا خانیوں کے ہیں جنہوں نے مختلف طریقوں سے ''سراج الحق'' کے ''چراغ'' کو بجھانا چاہا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی پھونکوں سے چراغ بجھانے کی قوت وصلاحیت ہی سلب فرمالی تھی۔

''نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن'' پھونکوں سے یہ چراغ بھلا بجھتا ہی کس طرح

اب وہ نام بھی پڑھ لیں مرحوم حاجی غوثی، مرحوم ڈاکٹر سلیمان، حاجی اسلام مرحوم، شباب پہلوان وغیرہم مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان سب کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا، میں نے بھی سب کو دل سے معاف کر دیا ہے، قصور ان لوگوں کا نہیں تھا، قصور ''انتخاب قدیری مرادآبادی'' جیسے لوگوں کا تھا۔

ایسے ماحول میں حاجی گلو صاحب، حاجی تصور حسین استاذ علیم الدین جیسے لوگوں نے ہر طرح سے میری نصرت وحمایت کی، اللہ تعالیٰ اُنہیں اس کا بہترین بدلہ جنت میں عطا فرمائیں۔ استاذ علیم الدین مرحوم ومغفور کے صاحبزادے ہارون اور ان کے پوتے ندیم سلمہٗ اب تک اسی پرانے تعلق کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہارون کو تو مجھ سے دلی تعلق ہے، میں اس کی قدر کرتا ہوں لیکن تجربہ یہی بتاتا ہے کہ محبت وہی

کام کی ہوتی ہے جس کے ساتھ ساتھ عقل بھی پوری ہو ورنہ بعض دفعہ وہی صورت ہو سکتی ہے جو کسی شخص کے پالتو ریچھ نے کرڈالی تھی کہ مالک سو رہا تھا اور ریچھ مکھی اُڑا رہا تھا، مکھی اُڑانے پر اُڑ جاتی اور پھر آکر بیٹھ جاتی، ریچھ بہت دیر تک مکھی اُڑاتا رہا مگر کب تک غصہ کو برداشت کرتا، مکھیوں پر جھنجھلا کر ایک پتھر پھینک مارا، مکھیاں بھی اُڑ گئیں اور ساتھ ہی مالک کی روح بھی پرواز کرگئی۔ ہارون میاں کی محبت کا انکار تو میرے لئے نہ رہے بانس نہ بجے گی بانسری ذرا مشکل ہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پوری طرح ان کے عقلمند ہونے کا اقرار بھی کچھ نہ کچھ تو مشکل ہے لیکن اس میں وہ بالکل معذور ہیں، کسی وقت ان کے سر میں سخت چوٹ آگئی تھی جس کی وجہ سے سر کا آپریشن ہوا تھا، اس آپریشن نے ان کے دماغ کو کمزور کر دیا ہے لیکن ان کی محبت اتنی ہے کہ دماغ کی یہ کمزوری ان کی محبت کو متاثر نہیں کرسکتی، اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے متعلقین کو بخیر وعافیت ایمان وعمل کے ساتھ زندہ رکھے۔ آمین

آشیانہ ہوٹل کا ضروری تعارف

آگرہ کی مشہور شاہی تاریخی جامع مسجد جو مغل خاندان کے مشہور بادشاہ شاہ جہاں کی بیٹی شہزادی جہاں آراء بیگم نے پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے بنائی تھی، یہ رقم خود اس کی شادی کیلئے محفوظ تھی، اس نے شادی کر کے اپنا گھر بسانے کے بجائے اپنا محل جنت خداوندی میں بنوانے کا فیصلہ کرلیا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے من بنی للہ مسجداً بنی اللہ لہٗ بیتا فی الجنۃ (جو کوئی دنیا میں اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کیلئے مسجد بنوائیگا اللہ تعالیٰ اس کیلئے (اپنی شایانِ شان) جنت میں محل بنوائیں گے)

آگرہ کی تاریخی شاہی مسجد اور ہوٹل آشیانہ بالکل آمنے سامنے ہیں،

جامع مسجد کے صدر دروازے کے بالکل سامنے ہوٹل آشیانہ ہے، یہ ہوٹل پہلے بسم اللہ ہوٹل کے نام سے ایک معمولی چھوٹا سا ہوٹل تھا جس میں کھانے اور رہنے دونوں ہی کا معمولی انتظام تھا، خود احقر نے بھی آگرہ آنے کے بعد اور بچوں کو بلانے سے پہلے اس ہوٹل میں کبھی کبھی کھانا کھایا ہے۔

۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو جب بابری مسجد کی شہادت کا ہنگامہ خیز حادثہ وسانحہ رونما ہوا اس وقت احقر اپنے غریب خانہ الہ آباد میں موجود تھا، اس کے بعد ہی آصف زیدی صاحب کے یہاں آیا تھا، ۱۹۹۵ء تک مستقل اور مسلسل طور پر الہ آباد آگرہ کی آمد ورفت برابر جاری رہی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں اہل خانہ کی وفات کے بعد تقریباً دو سال تک الہ آباد ہی میں قیام رہا اور الہ آباد کا یہ چکر میرے پاؤں کو لگا رہا، اس وقت تک پاؤں کی معذوری سے محفوظ تھا اور بے تکان آتا جاتا تھا۔

اہلیہ کی وفات کے بعد بھی کچھ دنوں تک آصف زیدی صاحب ہی کے یہاں قیام چلتا رہا تھا، نومبر ۱۹۹۷ء میں آصف زیدی کہیں گئے ہوئے تھے اور کسی وجہ سے تالا بدل گئے تھے، احقر جب گلی میں ان کے گھر پہنچا اور تالا بدلا ہوا پایا تو مجبوراً ہوٹل آشیانہ کی راہ لینا پڑ گئی جہاں کے ملازم بابو جی نے ایسے اچھے انداز سے میرا خیر مقدم کیا کہ میں نے ہوٹل آشیانہ کو اپنا مستقل آشیانہ ہی بنالیا، میرا اچھا خاصا آرام دہ مکان الہ آباد میں خالی پڑا ہے، پڑوسی مجھ کو یاد کر رہے ہیں سوچتا ہوں کہ اسے پھر آباد کرنے کی کوشش کروں میرا دل بھی کہہ رہا ہے کہ ؎

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے   پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

لوگوں کی زبان پر دو چیزوں کی کشش مشہور ہے، یعنی آب ودانہ کی کشش اور خاک گور کی کشش، خدا ہی کو معلوم ہے کہ ان دونوں کشش میں سے کون سی کشش

اوّل آئے گی، باقی جہاں تک اپنے دل کا تعلق ہے تو دل کی خواہش صرف اتنی ہے کہ میری زندگی کا آخری وقت الہ آباد و اکبرآباد دونوں ہی شہروں میں سے کسی بھی شہر میں ہو جو میرے وطن اقامت ہیں اور اگر غربت ومسافرت کی موت مقدر ہو تو سرزمین مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی موت سے بڑھ کر کسی اور جگہ کی موت کو نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ سرزمین ایسی ہے جو ہر کس و ناکس کو دفن کیلئے قبول ہی نہیں کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی نظر رحم وکرم ہی پر انجام بخیر موقوف ہے اور اسی انجام بخیر پر وہاں کی منزل آسان ہو سکتی ہے، رب توفنی مسلماً و الحقنی بالصلحین

باسمہ سبحانہٗ

شفیق محترم کرم فرمائے بندہ جناب رومؔی بھائی مدظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

ہدیہ سنیہ ''دینی نصاب'' موصول ہوا۔ جزاکم اللہ خیراً۔ دل باغ باغ ہوگیا۔

واہ ''دینی نصاب'' چہ خوشتر   نقش اول سے دوسرا بہتر
اس پہ دو دو ولی کا سایہ ہے   ایک رومی ہیں، دوسرے ہیں قمر
''ترجمانی'' ادب کا ہے شہ کار   زیور طبع خوب روشن تر
حسن باطن کے ساتھ ظاہر بھی   قرن سعدین کا یہ ہے مظہر
اس سے امت کو فیض پہونچے گا   کچھ تو جائے گا اس کا حال سنور
شرط یہ ہے پڑھا سنا جائے   ہوگی کھیتی تو پھر ملیں گے ثمر
مرد حاصل کریں گے اس سے دین   عورتوں کا بنے گا یہ زیور
ہیں مضامین مستند اس کے   اس پہ علماء کی ہو چکی ہے نظر
''تحفۂ نور'' بانٹنے والو   ہوں عطا تم کو نور کے منبر

اس کو پہونچائے بس خدا گھر گھر — ہے دعا یونسؔ دعا گو کی

محمد یونس عفی عنہ

مدرسہ دعوۃ الحق کڈی (گجرات)

۲۲رربیع الاول ۱۴۲۵ھ، ۱۳رمئی ۲۰۰۴ء

جواب منظوم

مولوی یونسؔ کو لکھتا ہوں سلام — حق تعالیٰ دیں انہیں عشرت کے جام

میں کہ رومیؔ ہوں تو لکھوں مثنوی — شاعری کی گو نہیں فرصت ذری

رات دن لکھنا ہی میرا کام ہے — صبح سے تا شام لکھنا کام ہے

خط لکھا تیرہ مئی کو آپ نے — مل سکا ہے بیس کو وہ خط مجھے

شاعری فرمائی خط میں آپ نے — میں بھی بیٹھا ہوں مصرعے ناپنے

شاعری آپ کی بہت ہی خوب — دل کو ہر شعر ہی ہوا مرغوب

ایک مصرع زرا کھٹکتا ہے — ذہن شاعر وہیں اٹکتا ہے

"اس پہ علماء کی ہو چکی ہے نظر" — خط کشیدہ کی لیجئے تو خبر

لام علماء کا ہو گیا مجزوم — کیوں یہ حرکت سے ہو گیا محروم

شعر گر آپ اس طرح لکھتے — وزن کے عیب سے تو بچ رہتے

ہیں مضامین مستند اس کے — اور مصنف بھی معتمد اس کے

آخری شعر اس طرح ہوتا — تا نہ گھر گھر کی یہ صدا سنتا

ہے دعا یونسؔ دعا گو کی — پہنچے ہر گھر یہ قیمتی گوہر

دو ہی گھنٹوں میں ہوا خط کا جواب — آپ سے کہتا ہے خط اب لاجواب

آج کل میرے ساتھ نذری ہیں — ساتھ ان کے شفا شذیہ ہیں

سب ہی سب کو سلام کہتے ہیں — صرف اب ہی نہیں مدام کہتے ہیں

نقد سب کو سلام ہم سب کا — کچھ نہ رکھئے ادھار اب تب کا

ہو عطا ہم سب کو حسن خاتمہ — حشر میں جنت بھی مل جائے خدا

رکھے حق رومیؔ کو محرومی سے دور — ہر شقاوت اور ہر شومی سے دور

وداعی خطاب

شہر آگرہ کے محترم برادران وعزیزان السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ سب کو ۱۴۲۵ھ کے آخری ماہ ذی الحجہ کی عید الاضحیٰ (بقرعید) مبارک ہو۔ آج اس وقت جب میں آپ سے مخاطب ہوں مجھے اب سے ۳۵ سال پہلے کی عیدالفطر یاد آرہی ہے جو ۱۳۹۰ھ (دسمبر ۱۹۷۰ء) کو ہوئی تھی۔

اس سال ماہِ رمضان المبارک اور ماہ نومبر ایک ساتھ چل رہے تھے، تاریخوں میں بھی صرف ایک دن کا فرق تھا، ٹھیک سے یاد نہیں رہ گیا کہ نومبر کی تاریخ آگے تھی یا رمضان المبارک کی، غالباً رمضان المبارک ہی کی تاریخ ایک دن آگے تھی اور عیدالفطر پہلی یا دوسری دسمبر کو ہوئی تھی۔

اس عیدگاہ میں وہ میری پہلی امامت کا دن تھا اس وقت میری عمر اللہ کے فضل وکرم سے ۸۴ سال کی ہو چکی ہے، اس وقت میری عمر کا سینتالیسواں سال تھا، اس طرح ہم نے اپنی زندگی کے تقریباً سینتیس سال یہاں گزارے ہیں۔ یہ ایک ریکارڈ مدت ہے، اتنا طویل قیام مسلسل طور پر میرا اپنے وطن الہ آباد میں بھی نہیں گزرا، اگر میں کہنا چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ آگرہ کے اس طویل قیام نے مجھے الہ آبادی کے بجائے اکبرآبادی بنا دیا تو شاید یہ بات غلط نہ ہوگی، نہ اسے مبالغہ کہا جا سکے گا۔

قیام آگرہ کے ابتدائی چند سال تو یقیناً میری ہمت وثبات قدمی کیلئے بہت

بڑی آزمائش تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت دستگیری کرتی رہی، اسی کی دستگیری کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ اس نے اس نووارد غریب الوطن کیلئے یہاں بہت سے مخلص احباب اور محسن کرم فرماؤں کے دلوں میں نصرت وحمایت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کردیئے۔ ایسے حضرات کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کی تعداد شر پسند عناد پرور لوگوں سے بہرحال زیادہ ہی تھی۔

اور مجھے یہ لکھتے ہوئے اور کہتے ہوئے دلی صدمہ محسوس ہوتا ہے کہ ان مخلصین میں سے بہت سے لوگ اپنے حسن سلوک کا عوض و بدلہ اور ثواب لینے کیلئے اس دارِ فانی کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور پہنچ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بہترین اجر وثواب عطا فرمائے اور جن لوگوں نے شر وعناد کا رویہ اختیار کیا تھا ان میں سے اکثر ایسے ہی لوگ تھے جو غلط فہمی میں مبتلا تھے، اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے۔

دل کو اصرار ہے کہ اس موقع پر اپنے چند مخلصین اور محسنین کا ذکر ضرور کر دیا جائے، جواب ہمارے درمیان موجود نہیں رہے لیکن یہ فہرست بھی لمبی ہے اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں کسی قابل ذکر محسن کا نام ذہن سے نکل نہ گیا ہو، اس لئے اس کو یوں ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے مگر کچھ نام ایسے ہیں جن کا ذکر نہ کرنے پر دل کسی طرح راضی نہیں ہو رہا ہے، اس لئے چند نام تو ذکر ہی کرنے پڑیں گے جو یہ ہیں۔

(۱) آگرہ کے مشہور طبیب حکیم سیّد سلطان احمد نیازی مرحوم ومغفور جو تقریباً میرے ہم عمر ہی تھے اور اختلاف مسلک کے باوجود ہر طرح میری نصرت وحمایت کی۔

(۲) حاجی محمد مسلم صاحب مرحوم دہلی والے چھم چھم گلی جنہوں نے مجھے آگرہ بلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

(۳) مولانا عابد حسین مرحوم آگرہ اخبار والے چھم چھم گلی۔

(۴) حاجی عبدالواحد مرحوم (حاجی گلو)

(۵) حاجی تصور حسین مرحوم (حاجی تصو)

(۶) استاذ علاء الدین مرحوم گھٹیا ماموں بھانجہ۔

(۷) حاجی محمد زبیر مرحوم۔

(۸) حاجی شان الٰہی مرحوم اوپل والے۔

(۹) حاجی شان الٰہی مرحوم ومغفور چیمس والے جن کی تاریخ وفات بھی میں نے ہی کہی، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کیسی خوبیوں کے آدمی تھے ''نشانِ الٰہی تھے شانِ الٰہی''۔

(۱۰) حاجی رفیق الدین صاحب (حاجی مدن) مرحوم جن کے احسان کا سلسلہ وفات کے بعد بھی قائم ہے کہ میرا قیام ہوٹل آشیانہ میں اب بھی باقی ہے۔

قرآن مجید میں دس کی گنتی کو کامل کہا گیا ہے، اس لئے میں بھی محسنین کی اسی قدر تعداد کا ذکر کافی سمجھتا ہوں ورنہ فہرست تو بہت لمبی ہے۔

میرا دل بھی بہت عجیب ہے، وہ یہاں پر اصرار کر رہا ہے کہ آگرہ کے محسنین کی یہ فہرست اگرچہ ان لوگوں کی ہے جو اس دنیا سے جا چکے ہیں لیکن یہ فہرست چونکہ نامزد ہے اس لئے اس فہرست میں ایک نام ایسا بھی آجانا چاہئے جو ابھی بقید حیات ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذات سے امید ودعا یہی ہے کہ ابھی وہ اور زندہ رہیں اور پروانے دارابن جائیں تبھی یہاں سے پرواز کریں۔

ان صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ احقر جس روز آگرہ آیا ہے اسی روز سے ان سے تعلق قائم ہوا اور ان سے یہ تعلق ہر موڑ پر قائم رہا ہے اور مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ میرے دل کی اس خواہش میں کہ میں ان کا تذکرہ ضرور کروں بہت ممکن ہے کہ وہ توجہ ڈال رہے ہوں کہ اس مضمون میں ان کا نام بھی آجانا چاہئے تو لیجئے ان زندہ بزرگ کا

نام بھی سن لیے، یہ ہیں حاجی عبدالمالک صاحب تاج جنرل اسٹور اور تاج ایجنسیز کے مالک اور جامع مسجد کے بہت پرانے اور باخبر و معاملہ فہم کرایہ دار اور اسی پہلو سے وہ اسلامیہ لوکل ایجنسی کے ممبر اگرچہ نہیں ہیں لیکن اس کی محراب ضرور ہیں۔

آغاز مضمون میں اپنے ابتدائی دور میں یہاں کی آزمائش کا کچھ تذکرہ ہو چکا ہے اسی کے تکملہ پر مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں کہ آگرہ میرے لئے ایک شجر گلاب تھا جو میرے آنے کے وقت صرف کانٹوں کا مجموعہ تھا پھر دھیرے دھیرے اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹتی گئیں اور آہستہ آہستہ اس میں ٹہنیاں نکلیں پھر پھولوں کا نمبر آ گیا اور اب وہی آگرہ گل و گلزار ہو گیا جس سے رُخصت ہونا بھی میرے صبر و ہمت کی آزمائش ہو گیا ہے۔

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں ۔۔۔ خوش رہو اہل چمن ہم تو سفر کرتے ہیں

والسلام

عبدالقدوس رومی

۱۰ر ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ

(ہوٹل آشیانہ، جامع مسجد، آگرہ)

سیر دہرہ دون

با مزا ہے کس قدر یہ سیر دہرہ دون کی ۔۔۔ فکر کو حاجت نہیں تخییل کی مضمون کی
جو بھی آتا ہے یہاں ۔۔۔ دیوانہ ہو جاتا ہے وہ
اب خصوصیت کہاں باقی رہی مجنون کی ۔۔۔ ہے شکاری کو میسر جیسا وہ چاہے شکار
دن میں بھی مل جائے گا ۔۔۔ حاجت نہیں شب خون کی
کوہ پہ چشمے یہاں ہیں نظارہ خوب ہیں ۔۔۔ پڑتی ہے کیفیت عجب ان کی [illegible] کی

دو پہاڑی بکروں کا لڑنا اگر دیکھے کوئی ۔۔۔ بھول جائے گا وہ کشتی پہلواں پختون کی
چار دیوانوں کے دل میں ہو گیا شوقِ شکار ۔۔۔ چل پڑے اک رات کو وہ چاروں ہی دیوانہ وار
فیصلہ ان کا ہوا پھر سیر دہرہ دون کا ۔۔۔ روپ بھر کر سب نے حلیہ کر لیا مجنون کا
ان میں دو گمنام تھے ۔۔۔ اور باقی دو بدنام تھے
ایک تھا ان میں کا فیصل دوسرا ابن زبیر ۔۔۔ ان کی تھی تفریح دل اور ان کا ہی یہ شوقِ سیر

محبّ مکرّم حافظ جاوید الحق صاحب، دہرہ دون

موصوف دہرہ دون جیسے سیر و سیاحت کے شہر سے کچھ فاصلہ پر ٹی اِسٹیٹ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔

پچھلے دنوں احقر چار ماہ کی طویل بیماری کے بعد مفتی شہر آگرہ ہونے کے ساتھ ساتھ آگرہ کا تیمور لنگ بھی ہو گیا تو عزیزم عبید سلمہٗ نے کہا کہ ہمارے والد (حافظ جاوید صاحب) آپ سے ملنا چاہتے ہیں، کچھ دنوں کیلئے دہرہ دون بھی ہو لیجئے۔ میں نے تبدیل آب و ہوا کے خیال سے اُن کی بات مان لی اور ہم دونوں دہرہ دون پہنچ گئے جہاں حافظ صاحب خیر مقدم کیلئے اِسٹیشن پر موجود تھے، اُن کے ساتھ ہی ٹی اِسٹیٹ اُن کے دولت خانہ تک پہنچ گئے۔ چند روز اُن کے یہاں قیام رہا، اب اس وقت جب یہ سطور لکھ رہا ہوں آج ہی شام کو مختصر مدت کیلئے پھر دہرہ دون کے سفر کا انظم ہو چکا ہے، اللہ بخیر و عافیت دہرہ دون کی بلندی پر اس معذور لنگ کو پہنچائے اور پھر بخیر و عافیت صحیح سلامت ہوٹل آشیانہ آگرہ تک واپس بھی لائے۔ وہاں ہوٹل میں ایک بستر کے کمرہ سے جو مجھے اُنس و تعلق ہو گیا ہے وہ مجھے اگر کہیں اور مل سکتا ہے تو وہ تلسی پور کا اپنا بنوایا ہوا غریب خانہ ہی ہو سکتا ہے۔ ہوٹل آشیانہ کا ذکر کرتے ہوئے خدا جانے کیسے مرزا غالب کا دعائی شعر یاد آ گیا اُسے

لکھ کر یہ بات ختم کرتا ہوں

قفص میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

احقر تقسیم ملک سے پہلے مرادآباد مدرسہ عالیہ امدادیہ میں مدرس تھا، اُس وقت یہ شعر کہا تھا

مچھلی شہر اصلی وطن مولد الہ آباد ہے   اب مرادآباد میں میری مراد، آباد ہے

۱۳۹۰ھ میں جب آگرہ آیا تو وہ شعر یوں تبدیل ہوگیا

مچھلی شہر اصلی وطن مسکن الہ آباد ہے   آگرے میں آگرا ہوں دل یہیں اب شاد ہے

اندازہ کچھ ایسا ہو چکا ہے کہ شاید میری شاعری واقعہ اور حقیقت نہ بن جائے۔ اکبرآباد میں مسلسل ۳۸ سال کی طویل مدت تک قیام ہو چکا ہے۔

مسلسل اتنی مدت تو اپنے وطن پیدائش الہ آباد میں بھی نہیں گزری ہے۔ دونوں ہی شہروں کے نام میں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کا ایک ایک جزء موجود ہے۔ ناموں کا یہ اشتراک بہرحال پُرلطف اور معنی خیز ہے۔

دید رومؔی سے کہیں بہتر شنید   سننے والے جب کہیں ھل من مزید

مقولہ عربی وتسمع بالمعیدی خیر من ان تراہ کو اُردو میں منتقل کر دیا گیا ہے، اس اشارہ کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو چلنے کیلئے دو پاؤں، کام کیلئے دو ہاتھ، دیکھنے کیلئے دو آنکھیں، سننے کیلئے دو کان دئے ہیں۔

کہے ایک سن لے جب انسان دو   کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

مگر اب احقر اپنی ٹانگوں سے معذور ہے کہیں آنا جانا دشوار ہے، اس لئے

اسکے قدم تو بالکل چل ہی نہیں سکتے لیکن حق تعالیٰ نے دل و دماغ اور عقل وفہم کو بفضلہٖ تعالیٰ صحیح باقی رکھا ہے، بیٹھے بیٹھے کچھ خوش گفتاریاں اور قلم کاریاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں جس کا کچھ اندازہ ناظرین کو بھی ہوسکتا ہے۔

اس وقت کہنے کا مقصد یہ ہے کہ احقر کی تحریروں کو پڑھ کر لوگ اسے دیکھنے کیلئے شدرحال ہرگز نہ فرمائیں کیونکہ یہاں انہیں ایک ٹانگوں سے بالکل معذور اور چشم وگوش کا آدھا معذور، ایک لب گور پہنچا ہوا نحیف ونزار، اٹھاسی سال کی عمر کا آدمی دیکھنے کو ملے گا جو انکی بات سن ہی نہ سکے گا تو انہیں جواب کیسے دیگا۔ وہی مثل ہوگی کہ سوال از ریسماں، جواب از آسماں یا اسکے برعکس سوال از آسماں جواب از ریسماں (سوال تو آسمان سے متعلق مگر جواب رسّی سے متعلق دیا جا رہا ہے) لہٰذا کوئی صاحب دور سے احقر کی بے بنیاد شہرت سنکر ''دید'' کیلئے سفر نہ فرمائیں۔ دور سے تذکرہ سننے ہی کو کافی اور بہتر وغنیمت سمجھیں اور معذور احقر کو دیکھنے کے بجائے اس کی یہ آخری تحریر ہی پڑھ لیں تو انہیں حضرت اصغر گونڈویؒ کا یہ شعر اچھی طرح سے بات کو سمجھا دیگا۔

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا   اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

راقم سطور شاعر کم ابوالقلم کچھ زیادہ ہے، اس لئے اسے اسکی نثری تحریروں کے ذریعہ ہی آسانی سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

یلوح الخط فی القرطاس دھراً   وکاتبہٗ رمیمٌ فی التراب!

کاغذ میں جو لکھا ہے چمکتا رہیگا دوست   اور لکھنے والا خاک میں مل جائیگا یہاں

رہے نام باقی بس اللہ کا

ابوالقلم رومؔی غفرلہٗ

دارالقلم، آشیانۂ جامع مسجد، آگرہ

فہرست

دینی، علمی، فقہی، تحقیقی، تنقیدی، ادبی، شعری تصنیفات، تالیفات اور وقتی مضامین و مکاتیب

ماہنامہ ’’شگفتہ‘‘ (از انجمن ہدایۃ الرشید مظاہر علوم سہارنپور) ١٣٦٠ھ

حقوق الزوجین کی بحث ایلاء پر ایک نظر (صدق جدید لکھنؤ) ١٣٦٢ھ

مدینہ کا جعلی فتویٰ (اخبار مدینہ بجنور کے ایک غلط فتوے کی تردید) ١٣٦٦ھ

شد الوثاق لمن حل نطاق الطلاق (١٣٦٧ھ)

حاشیہ بہشتی زیور (١٣٦٨ھ)

میر انیس کے دو مرثیے (١٣٦٩ھ)

ماہنامہ ’’الاحسان‘‘ الہ آباد (١٣٧٠ھ تا ١٣٧٤ھ)

نظریہ تمہید الفاظ (نیا دور لکھنؤ) ١٣٧٩ھ

شہید کربلا اور یزید پر تبصرہ (ماہنامہ ’’تجلی‘‘ دیوبند) ١٣٧٩ھ

دیباچہ معرفت (انتخاب ملفوظات حکیم الامت ’’و تعلیمات مصلح الامت‘‘)

دیوبند سے بریلی تک (١٣٨٤ھ)

رضاخانیت سے شفا کیلئے نسخہ عجیب فیصلہ کن اُنیس سوالات (تلخیص اسکات المعتدی) ١٣٩٠ھ

دو مقدمے اور دو سوال (١٣٩٠ھ)

حیات اعلیٰ حضرت کے بعض اہم اور مخفی پہلو (١٤٠٠ھ)

رحمت اسلام (مکاتب اسلامیہ کے درجہ اطفال کیلئے پانچ حصوں پر مشتمل)

اسلامی تاریخ کی کہکشاں (اخبار ’’قائد‘‘ الہ آباد)

مثنوی فروغِ اسلام (دو حصے)

گوہر مقصود (فضائل درود)

احمدی یا غلمدی؟ (فرقۂ غلمدیہ یا جماعت احمدیہ اپنے لٹریچر کی روشنی میں)

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ (نسبندی کی تردید، ایمرجنسی کے ہولناک دور میں)

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات (اُردو)

اسلام ایک سمپورن جیون درشن (ہندی) بالا صاحب دیورس

(صدر آر ایس ایس کا سبھاش پارک آگرہ میں رودر رو نقد جواب)

اسلام کی کہانی اسلام کی زبانی

دار القضاء کیوں اور کیسے؟

صفحۂ نور میں چشمۂ ظلمت

تردید مودودیت کا بہترین سیٹ (اٹھارہ کتب و رسائل پر مشتمل)

ایکسرے رپورٹ (دو حصے)

ایک آئینہ میں تین چہرے

مودودیت بے نقاب

الیس منکم رجل رشید؟

مودودی لٹریچر میں تین خطرے

اسلامی حکومت کی کہانی

حقیقت کی روشنی

تصویر کا دوسرا رُخ

تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش (تین جلدیں)

نظر الامعان فی تفہیم القرآن

مہربانوں کے خطوط اور ان کے جوابات

حاصل مطالعہ (تین حصے)

بردًا وسلامًا (جماعت اسلامی کی ایک فرضی ڈمی کا جواب)

عید میلاد النبی کی تقریبات دین وعقل کی روشنی میں

والیٔ شرعی کے بغیر قاضیٔ شرعی کا تقرر؟

دار العلوم کا حال ماضی کے آئینہ میں

دینی مدارس کا رجسٹریشن؟

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اپنے بنیادی موقف سے انحراف

اسلامک فقہ اکیڈمی آف انڈیا کیا ہے؟

قانونِ اسلامی میں ترمیم وتبدیل مسلمانوں کیلئے ناقابل قبول

جے پور کا فقہی سمینار ایک مشاہد کی نظر میں (المآثر مئو)

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے " "

طبقات فقہا کی ضرورت واہمیت " "

طلاق ثلاثہ وطلاق سکران کا شرعی حکم

مفتیان کرام کیلئے لمحۂ فکریہ (البلاغ، کراچی)

آزاد مفسرین

(سرسیّد احمد خاں، ابوالکلام آزاد، عنایت اللہ مشرقی، ابوالاعلیٰ مودودی، وحید الدین خاں)

نظام الحج (ضمیمہ سراج الحج)

نظم المفتی

احناف کی مستند نماز کا ثبوت

حجیت قرآن (ہمدرد یونیورسٹی دہلی میں خطاب)

قیامت سے پہلے قیامت (ہمدرد یونیورسٹی دہلی میں خطاب)

آئینہ یاد حبیبؐ تاریخی سیرت (بفرمائش ناظر افضال صاحب مقیم جدہ)

غازیٔ طائف ویرموک (حضرت سیّدنا ابوسفیان امویؓ)

شاہ نیاز احمد بریلوی کی عربی شاعری (معارف، اعظم گڑھ)

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی کا سلوک واحسان (ترجمان دار العلوم دیوبند، دہلی)

بظاہر تاریخ مظاہر فی الحقیقۃ نظر بندیٔ ناظر

مجلس شوریٰ یا مجلس تائید؟

مظاہر علوم کے مرثیہ کے وقت قصیدہ!

ذکر لطیف وشریف (اصلی مظاہر علوم کے شریف ومظلوم ناظم اعلیٰ مرحوم)

حضرت شیخ الحدیث اوران کی فقہی خدمات

تعارف فتاویٰ مظاہر علوم سہارنپور (فکر اسلامی بستی)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا دورِ اوّلیں الفرقان کا دورِ زریں

صاحب دعوت وعزیمت

حضرت مولانا علی میاںؒ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ

تذکرہ برادرِ محترم مولانا عبید اللہ بلیاویؒ

حضرت صدیقؒ کی کہانی انکے صدیق کی زبانی

مجیب المجیب (ریاض الجنۃ، جونپور)

حادثۂ بابری مسجد

وندے ماترم کی شرعی حیثیت (ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور)

پلس پولیو کا شرعی حکم

مروجہ اجازت وخلافت کی حقیقت (نظم)

(بخدمت رائج الوقت مشائخ طریقت)

تسہیل مصالح الصلوٰۃ

تقدمۂ تاریخ عزت اسلام

تنویر الادب من کلام العرب

مظاہر الادب من جواہر العرب

ندائے رحمٰن (نوے آیات قرآنی یا ایھا الذین آمنوا کی تفسیر)

دینی نصاب (قرآن وحدیث سے تین سو ساٹھ یومیہ اسباق، دو جلدیں)

شاہراہِ اسلام

سراج الاسلاف لاخلاف السراج

کافیۂ مصلح الامت کے شارح مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ (حالات مصلح الامتؒ)

ہمارے بھائی جی مرحوم (ذکر جامی)

مکاتیب رومی (مشاہیر کے نام اہم خطوط)

علم کی حقیقت (آئینہ مظاہر علوم وقف سہارنپور)

ایفائے وعدہ (نظم)

بت پرست بنام قبر پرست (نظم)

مسلمانوں کے تین بنیادی عقیدے

اسلامی تقویم برائے الہ آباد

اسلامی سالِ نو

ٹی وی اہل ایمان کیلئے ٹی بی

فکری ارتداد (قومی آواز)

یاد رکھئے

مصلحین معاشرہ کی خدمت میں (جامعۃ الہدایہ، جے پور)

اصلاح معاشرہ کیلئے اپنی دوستیاں بدلنی ہوں گی!

گزارش بخدمت اہل مدارس

اپنی فکر بدلئے

دینداری کا معیار

اپنی پہچان باقی رکھئے

دس علامات قیامت

مجموعۂ چہل حدیث

مجموعۂ خطبات نکاح

جہیز بارِ گراں بن گیا ہے ملت پر (نظم)

دینی جہیز (نثر)

استدراک بر تحفۂ نکاح

کیا آپ کو معلوم ہے؟

ہزار بات کی ایک بات

اصل سُپر پاور اللہ تعالیٰ کی ذات ہے

بیاض رومیؔ (الرقی والعزائم)

مثنوی رومیؔ (اُردو میں نفحۃ الیمن کی ایک حکایت کا منظوم ترجمہ)

دل خیز نغمۂ عنادل

چند غزلوں کا مختصر مجموعہ

قطعات عربی و فارسی کے منظوم تراجم

تاریخی دعوت نامے

شرعی سہرا

حادثۂ بابری مسجد (مرثیہ)

دعائے سیدنا انسؓ

نخلع و نترک من یفجرک؟

اورادِ قرآنی حرزِ ایمانی

آیاتِ قرآنی سے سیاق و سباق سمجھے بغیر استدلال گمراہ کن!

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کے نام مکتوب)

کیا تعلیم کا مصداق صرف دنیوی اور عصری تعلیم ہے؟

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چھوٹے سرسید سے سوال)

مسئلہ کفو (نسب پر تفاخر تو مذموم ہے مگر اس کا تحفظ مطلوب ہے)

(ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے سوال کا جواب)

''لقد ضاء شعری علی بابکم'' پر تنقید کی تردید! (فکر اسلامی بستی)

مجاہدین فلسطین کا پیغام (نظم)

لال مسجد (قطعہ)

فتاویٰ (از دار الافتاء، جامع مسجد، آگرہ)

فیصلے متعلقہ رویت ہلال جامع مسجد، آگرہ

فیصلے محکمہ عدلیہ شرعیہ اکبر آباد

قضایا محکمہ عدلیہ شرعیہ الٰہ آباد

ہندوستان میں دار القضاء یا شرعی پنچایت؟ (دہرہ دون)

دل افزا یادوں کے چراغ (۱۴۲۸ھ)

گل افشاں حیاتِ ماضی رومیؔ (۲۰۰۸ء)

اکابر امت کے ارشادات، تاثرات اور معاصرین کے اعترافات

میرے محترم مولوی رومؔی! آپ دیکھیں نہ چہرۂ شومی

(حضرت استاذی مولانا اسعد اللہ رامپوریؒ)

وہ حافظ ہیں عالم ہیں قاری بھی ہیں وہ باطل پہ بدعت پہ بھاری بھی ہیں

(عم محترم حضرت سیّد عبدالرب صوفیؒ)

☆ مولوی حافظ عبدالقدوس رومؔی سلّمہٗ، خلف صدق حاج مولانا سراج الحق صاحب مدظلہٗ ساکن الہ آباد نے مدرسہ عالیہ امدادیہ مراد آباد میں ایک سال (۱۳۶۶ھ) درسِ نظامی کی کتابیں پڑھائی ہیں، جہاں تک ہمارا خیال ہے مولوی صاحب موصوف تدریس کے اہل ہیں، طبیعت میں ذکاوت و جودت بھی خوب ہے اور قابل و مستعد ہیں۔

(حضرت مولانا محمد حیات سنبھلیؒ، صدر مدرس مدرسہ عالیہ امدادیہ، مراد آباد)

☆ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بار آور فرمائے، آپ کیلئے دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے اور لوگوں کو اس (تردید مودودیت) سے مستفید فرمائے، یہ ناکارہ آپ کیلئے دل سے دعا کرتا ہے۔

(شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ)

☆ آپ کی تحریریں پڑھتا ہوں، ماشاء اللہ آپ کی گرفتیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔

(حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب دیوبندیؒ)

☆ اس موضوع (مودودیت) پر آپ...... کا تعاقب لائق صد تحسین ہے، بحمد اللہ علماء

ہیں آپ جیسے احبار ابھی موجود ہیں جو سلفی ذوق و ثقافت میں اتقان کی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ...... کو اس دورِ پُرفتن میں تحریف غالین و انتحال مبطلین و تاویل جاھلین میں ینفون والے عبادِ صالحین میں داخل و لاحق فرمائے۔ الخ (آمین)

(حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہیؒ نبیرۂ حضرت گنگوہیؒ)

☆ ماشاء اللہ اپنے اکابر کا سا علم و اتقان اور مضبوط طبیعت و ہمت رکھتے ہیں۔ مل کر بہت جی خوش ہوا۔

(مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان شیروانیؒ)

☆ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ دار العلوم و مظاہر علوم کے فارغین کو فرق ضالہ و مضلہ کے تعاقب اور تردید کی تحریری تربیت دیں۔

(فقیہ زمن حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ)

☆ آپ کے مضامین پڑھتا ہوں، بہت دل خوش ہوتا ہے۔ آپ کیلئے دل سے دعا کرتا رہتا ہوں۔

(پیر طریقت حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ)

☆ ماشاء اللہ مفتی صاحب ردِ مودودیت وغیرہ پر سند کا درجہ اور مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں ان سے رجوع کرنا چاہئے۔

(محی السنہ والقرآن حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئیؒ)

☆ فاضل محترم جناب مولانا عبدالقدوس رومؔی صاحب ہندوستان کے ایک معروف و مستند عالم دین اور اُردو کے منجھے ہوئے مصنف اور صاحب قلم ہیں۔ مولانا ایک نامور علمی، شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور مستند فقیہ و مفتی کا منصب بھی ان کو حاصل

ہے، میرے دل میں مولانا کی بڑی قدر ہے، میں تو مولانا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے۔ آمین

(مفکر ملت حضرت مولانا علی میاں ندویؒ)

☆ اس وقت ہماری جماعت میں سب سے دلیر اور دبنگ آدمی مفتی عبدالقدوس رومیؔ ہیں، ان کو دارالعلوم دیوبند میں مفتی کی حیثیت سے بلا لیا جائے۔ وہ سیاسی مزاج کے لوگوں کا دماغ درست کر دیں گے۔

(حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند)

☆ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے بعد دہلی میں کوئی ایسا مسلک حق کا علمبردار مفتی نہیں ہے جیسا ہونا چاہئے، اگر آپ تشریف لے آئیں تو جمعیۃ علماء ہند کے تحت نظم کیا جائے۔

(حضرت مولانا اسعد مدنیؒ، صدر جمعیۃ علماء ہند)

☆ آپ کو تو دارالعلوم دیوبند میں ہونا چاہئے تھا۔

(حضرت مولانا ارشاد احمد فیض آبادیؒ)

☆ دارالعلوم دیوبند کی مسند افتاء پر اب تو آپ جیسے اشرف الفکر مفتی کو ہونا چاہئے۔

(مولانا انظر شاہ کشمیری مرحوم)

☆ مظاہر علوم سہارنپور کے دونوں گروپوں میں مصالحت مفتی عبدالقدوس رومیؔ تو کرا سکتے ہیں کیونکہ وہی اس کے سرپرستان میں جچے، تلے اور منصف مزاج آدمی ہیں۔

(حضرت مفتی نسیم احمد فریدی امروہویؒ)

☆ ہم لوگ مودودی صاحب کے لٹریچر کے بارے میں جو تعبیر اب تک نہیں کر سکے تھے وہ آپ نے اپنے اس رسالہ ''تین خطرے'' میں کر دی ہے۔

(حضرت مولانا صبغۃ اللہ بختیاریؒ)

☆ میرے علم و نظر میں قریباً ۵۴ سال کے عرصے میں مودودی صاحب کے لٹریچر پر ایسا رسالہ نہیں لکھا گیا جیسا آپ نے ''مودودیت بے نقاب'' لکھا ہے۔

(بانی الفرقان حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

☆ امیر جماعت اسلامی ہند کی کتاب ''یٰلیت قومی یعلمون'' کا جواب ''الیس منکم رجل رشید'' کو میرے خیال میں سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بھی چیلنج اور رد نہیں کر سکتا۔

(امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ)

☆ اللہ تعالیٰ نے مولانا رومیؔ کو مودودی صاحب کی تعبیرات سمجھنے اور اس پر گرفت کرنے کا بڑا سلیقہ اور بڑی قدرت عطا فرمائی ہے۔

(حضرت مولانا معراج الحقؒ، نائب مہتمم دارالعلوم، دیوبند)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مودودی صاحب کی تکنیک سمجھا دی ہے، اب آپ اس موضوع کو اپنا لیجئے اور اس پر اچھی طرح لکھ دیجئے تو ایک مفید کام ہو جائے گا۔

(حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھیؒ)

☆ مختلف اوقات میں آپ کی مؤلفات موصول ہوتی رہیں، ماشاء اللہ آپ کی یہ سب مؤلفات اپنے موضوع پر بہت زوردار ہیں۔ زیغ و ضلال کی چیزوں کو آپ نے ڈھونڈ کر نکالا ہے اور جو چیزیں قرآن و سنت اور اجماع و قیاس سے ہٹی ہوئیں ہیں ان کی خوب خوب نشاندہی اور پھر اُن پر بہت زوردار گرفت کی ہے۔ اصلاح افکار کا کام کرنے والوں کیلئے آپ انتہائی شکریہ کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل کے ساتھ ساتھ اظہار کی جرأت بھی دی ہے جس سے ہم لوگ عموماً عاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضرت مفتی صاحب مدظلہ کو گونا

گوں صفات علمی، تحقیقی اور فقہی وادبی سے نوازا ہے۔

(حضرت مفتی مظفر حسین اجراڑویؒ سابق مفتی اعظم مظاہر علوم سہارنپور)

☆ آپ بجا طور پر مسلک دیوبند و تھانہ بھون کے بہترین ترجمان ہیں۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

(شیخ طریقت حضرت مولانا قمر الزماں اعظمی)

☆ ردمودودیت پر اپنی تحریریں بغرض اصلاح بھیجتے اور اہم علمی امور میں استشارہ فرماتے اور یہ شعر لکھتے۔

عمرت دراز بادا تا دور مشتری　　ما از تو برخوریم تو از عمر برخوری

(مفتی اعظم گجرات حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ)

☆ سادگی میں پُرکاری یہی اچھے شعر کا معیار ہے اور وہ آپ کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

(نواب جعفر علی خاں آثر لکھنوی)

☆ آپ کی تحریریں شستہ و شگفتہ، سلیس و رواں اور تلخ وشیریں ہوتی ہیں جن میں اکبر الہ آبادیؒ اور عبدالماجد دریابادیؒ کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کے قلم سے اگر ایک طرف تفسیر وحدیث اور فقہ وفتاویٰ کے ذخیرے جمع ہوئے ہیں تو دوسری طرف نظم ونثر، لکھنوی، دہلوی اُردو میں مثنوی، غزل، قصیدے، مرثیے، تہنیت نامے، تعزیت نامے، مدح، ہجو، لطیفے اور فقرے بھی دل ودماغ اور زبان وقلم سے ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے ہیں جو ایک فقیہ نقاد اور ادیب طناز کے قلم سے ادبی جواہر پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ مظاہر علوم سہارنپور کے متفقہ دورِ مسعود میں مادرِ علمی نے اپنے لائق فرزند کی

حیثیت سے آپ کو اپنے محقق، مصنف، مناظر، اہل قلم مظاہری علماء میں شمار کیا ہے جنہوں نے اہل باطل کے تعاقب اوران کی تردید میں بطل جلیل کا کردار ادا کیا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

عقبیٰ حقیقت دنیا کہانی

اللہ کا کوئی ساتھی نہ ثانی　　اللہ ہے باقی اور سب ہے فانی

جانا ہے سب کو دنیا ہے جانی　　ہم سب بھی فانی دنیا بھی فانی

دنیا سرائے منزل ہے عقبیٰ　　عقبیٰ حقیقت دنیا کہانی

تھی زیست اپنی خوابِ پریشاں　　جسکی حقیقت ہم نے نہ جانی

ہے میل ہاتھوں کا یہ مال ودولت　　دنیا ہوئی ہے جس کی دوانی

حق نے کہا ہے دنیا ہے دھوکہ　　حق کی نصیحت ہم نے نہ مانی

رومیؔ نہیں ہے غم خوار اپنا
کس سے کہوگے غم کی کہانی

مرثیہ سراج دیں عارف باللہ شاہ مسیح اللہؒ

۱۹۹۲ء

دل میں وفورِ غم سے قیامت کا جوش ہے
بے اشک تھی جو آنکھ وہ طوفاں بدوش ہے

جذبات غم مچلتے ہیں سینے میں باربار
اک چپ لگی ہے آج زباں کیوں خموش ہے

کیا بات ہے یہ تابِ سماعت کہاں گئی؟
یہ کس خبر سے ہو گیا کر گوش ہوش ہے

کیا کہہ رہے ہیں لوگ خدایا یہ کیا ہوا؟
ہیجان اپنی جان ہے بیہوش ہوش ہے

کہتے ہیں سب کہ دل کا مسیحا چلا گیا
رحلت پہ جس کی آج بپا یہ خروش ہے

تھانہ بھون کے پاس ہی مرشد کی اک شبیہ
حضرت کی ایک ذات تھی سو اب پردہ پوش ہے

یہ غم ہے آہ وہ تو گئے ہم یہاں رہے
قدرت پہ کب ہے زور؟ کہاں عقل و ہوش ہے

وہ چل دئے تو جینے کا جیسے مزا گیا
اب جان بار جسم ہے، سر بار دوش ہے

وہ کیا گئے بہارِ گلستاں چلی گئی
جو گل ہے وہ اداس ہے بلبل خموش ہے

ویران میکدہ ہوا، میخوار تشنہ لب
ساقی نہیں تو اب کسے پینے کا ہوش ہے

اللہ کی قضا پہ جھکے سر بصد نیاز
شکوہ نہ لب پہ آئے جو کچھ عقل و ہوش ہے

ہم سب اسی کی ملک ہیں جائینگے اسکے پاس
سمجھے گا اسکو حق جو حقیقت نیوش ہے

سوچو تو کون باقی ہے اللہ کے سوا
جو بھی یہاں ہے فانی ہے خانہ بدوش ہے

آیا اگر ہے آج تو جائے کل ضرور
ہاتف کی یہ ندا ہے صدائے سروش ہے

حضرت جلال آبادی مجسم جمال تھے
گر دیکھتے ملک بھی، سمجھتے سروش ہے

حضرت تھے معرفت میں خلائق کے خضرِ راہ
وہ کیا ہوئے خموش کہ خلقت خموش ہے

حق سے ملی تھی ان کو سیادت طریق کی
جو سالکِ طریق ہے حلقہ بگوش ہے

رومی جو تم کو چاہئے تاریخِ ارتحال
غالب کا مصرعہ لے کے نکالو جو ہوش ہے

کم کر دو تم "لقب" کے عدد پہلے پھر کہو
"جو شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

۱۳۲

۱۹۹۲ء=۱۳۲-۲۱۲۴

ابوالقلم عبدالقدوس رومی (مفتی شہر آگرہ)

University of Lucknow

Whereas Mohammad Abdul Quddus has pursued a course of study prescribed by this University for the Diploma of **Fazil-i-Adab** (Arabic) and has passed the requisite examinations in the First Division

This is to certify that he has this day been duly awarded the Diploma of **Fazil-i-Adab** (Arabic) of this University at the Convocation of 1948

Convener,
Board of Oriental Studies
in Arabic and Persian.

[signature]
Registrar.

Vice-Chancellor.

Lucknow,
Dated the 27 JAN 1949 194

University of Lucknow

Whereas Mohammad Abdul Quddus Roomi has pursued a course of study prescribed by this University for the Diploma of **Dabir-i-Kamil** (Persian) and has passed the requisite examinations in the First Division

This is to certify that he has this day been duly awarded the Diploma of **Dabir-i-Kamil** (Persian) of this University at the Convocation of 1949.

M. A. Mirza
Convener,
Board of Oriental Studies
in Arabic and Persian

K. D. Tewari
Registrar.

Narendra Deva
Vice-Chancellor.

Lucknow.
Dated the 20th. December, 1949.